منٹو
(سوانح)

منٹو

ابو سعید قریشی

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

باراوّل : گیارہ سو

قیمت : سوا چار روپے

پرنٹر : سویرا آرٹ پریس لاہور

پبلشر : محمد طفیل ادارہ فروغ اردو
لاہور

منٹو کی ہر تحریر "۷۸۶" سے شروع ہوتی تھی۔

میں اُس کی یادوں کو اِسی پر اسرار عدد سے منسوب
کرتا ہوں۔ معاشرہ اُس کے "گناہ" معاف نہ کر سکا۔
لیکن "اللہ بڑا بخشش کرنے والا مہربان ہے"

(ابو سعید قریشی)

تمغہ
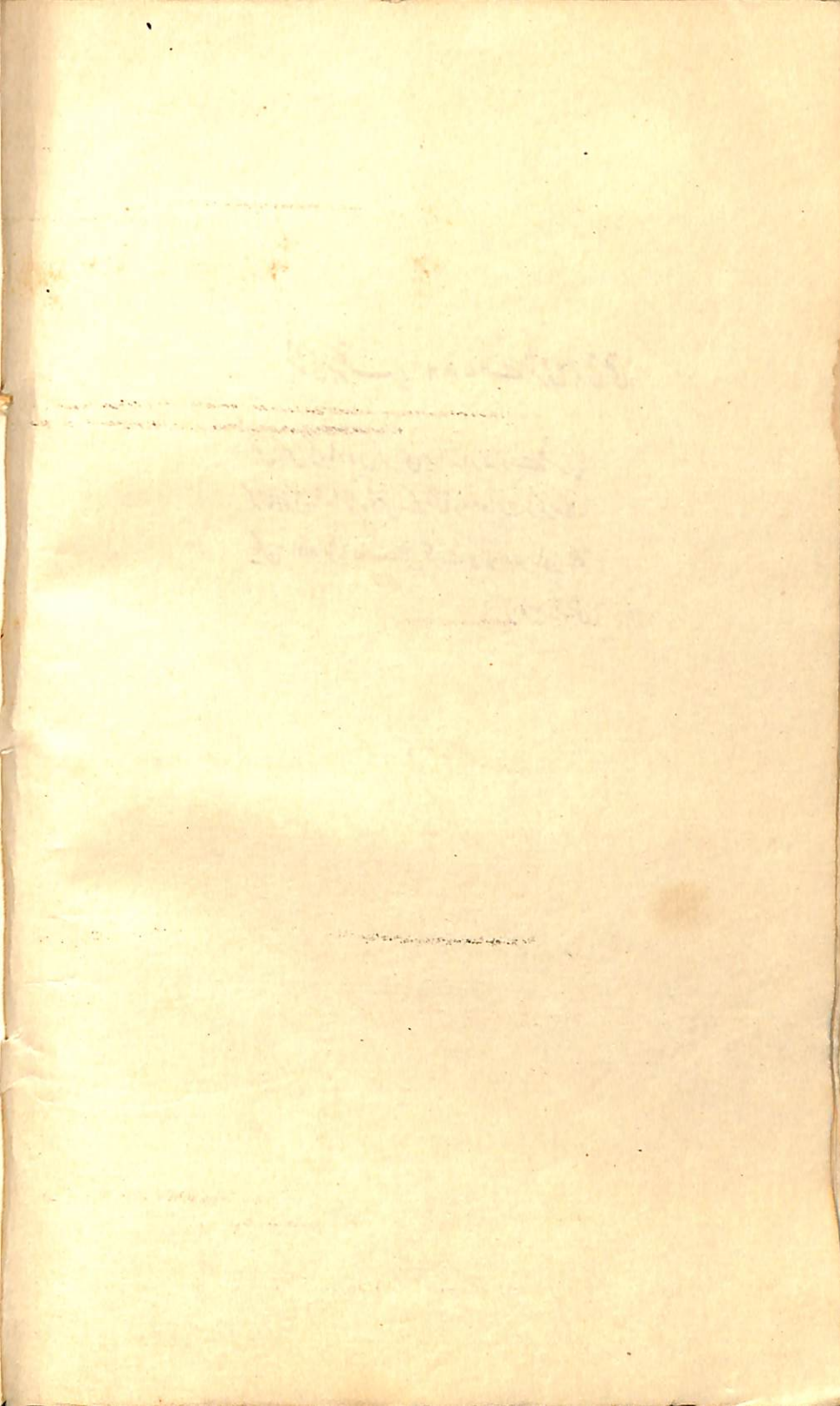
فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبحِ مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز (غالب)

"...... میرا دل آج بہت افسردہ ہے...... میرے دل میں اب سارا غصّہ افسردگی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میں بہت ملول اور مغموم ہوں....... میری افسردگی مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔ میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے دن رات مشقت کرنے کے بعد بمشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روزمرہ کی ضروریات کے لئے پورا ہو سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی اور تین کم سن بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس

دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند سہی لیکن ایک بیوی

کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ ہوں — اِن میں سے اگر کوئی

بیمار ہو جائے اور موزوں و مناسب علاج کے لیئے مجھے در در

کی بھیک مانگنی پڑے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔ میرے

دوست بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ اگر میں اُن کی

مدد نہ کر سکوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے ...... میں کسی کا یا اپنا

سر جھکا ہوا دیکھوں تو خدا کی قسم مجھے دُکھ ہوتا ہے ..... لیکن

جب میں سوچتا ہوں کہ اگر میری موت کے بعد میری تحریروں پر ریڈیو

اور لائبریریوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور میرے فسانوں

کو وہی رتبہ دیا گیا جو اقبالؔ مرحوم کے شعروں کو دیا جا رہا ہے

تو میری روح سخت بے چین ہوگی۔ میں اِس بے چینی کے پیشِ نظر

اُس سلوک سے بے حد مطمئن ہوں جو اب تک مجھ سے روا رکھا

گیا ہے۔ خدا مجھے اُس دیمک سے محفوظ رکھے جو قبر میں میری سوکھی

ہڈیاں چاٹے گی ..... فتوے دینے والے سوچ رہے ہیں اور

اب پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لیئے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں

ترقی پسند ہوں ...... اور فتووں پر اپنے فتوے دینے والی

سرکار مجھے ترقی پسند یقین کرتی ہے، یعنی ایک "سرخا" کمیونسٹ

کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا

دیتی ہے۔ دوسری طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی

دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب
اور افسانہ نگار ہے، جس کا قلم گزشتہ ہنگامی دَور میں بھی رواں دواں
رہا...... میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر
ایک تمغہ میرے کفن کے ساتھ ٹانک دے گی۔ جو میرے
داغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہو گی......"

سعادت حسن منٹو

لاہور۔ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء

منٹو کے مجموعہ "یزید" کا یہ آخری مضمون ہے۔ "جیب کفن" سعادت کا ایک مفلوک الحال دوست (جو مرحوم کی بیوہ اور بچیوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا) آج اپنی یادوں کا تحفہ اُس کے کفن کے ساتھ ٹانک رہا ہے۔ اِس تمغہ پر چند بے ربط الفاظ کندہ ہیں۔ شاید اہلِ نظر ان میں کچھ ربط پیدا کر سکیں

ابو سعید قریشی

پشاور، ۱۷ر فروری ۱۹۵۵ء
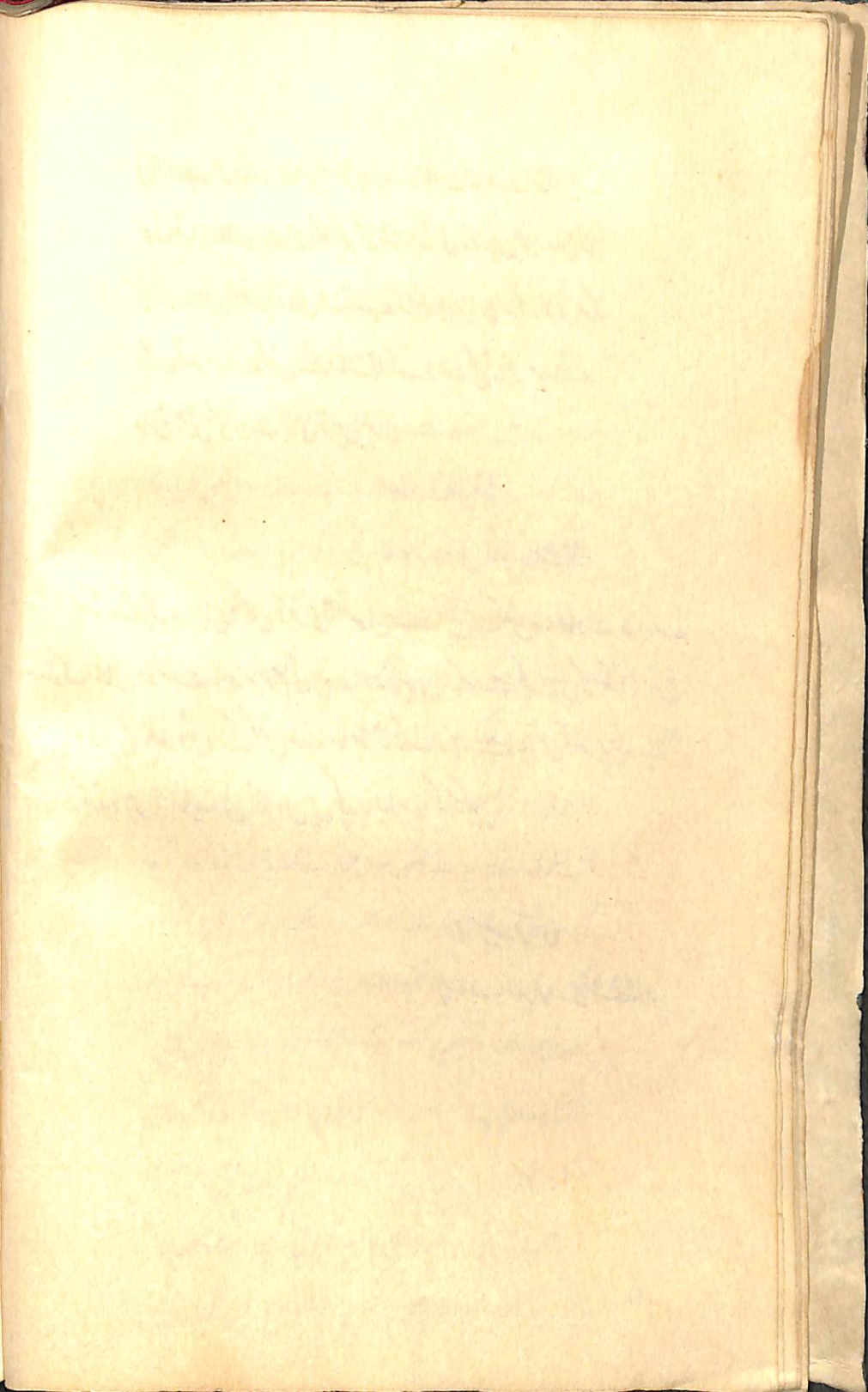
رحمدل دہشت پسند

تاریخ پیدائش
۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء

۷۸۶

"کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے
سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار
و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے
نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے
یا خدا!

سعادت حسن منٹو
۱۸ر اگست ۱۹۵۴ء"

اپنے مداحوں کو وہ کوئی ایک سال سے اِسی قسم کے آٹوگراف دے رہا تھا لفظی ردّو بدل کے ساتھ وہی موت کا اعلان ، وہی اپنی عظمت کا احساس ـــ وہی انا الحق کا نعرہ! ـ منصور نے یہی نعرہ لگایا تھا ـ آج ہم نے بھی ایک اور منصور کو مار ڈالا ہے ـ آئیے اب اُس کے مزار پر پھول چڑھائیں اور اُس کی روح کو اپنی پشیمانی کا ثواب پہنچائیں ـــ

پشاور یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی آٹوگراف بک پہ ایک اسی قسم کا کتبہ لکھتے وقت اس نے تاریخ کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی اور کہا تھا کہ مرنے کے بعد میں تاریخ لکھ سکتا ہوں اُس کے مداح نے وہ جگہ ضرور پُر کر لی ہو گی ـ

تاریخِ وفات : ۱۸ ، جنوری ۱۹۵۵ء

منٹو میرا دوست تھا ـ دوست میں آدمی صرف خوبیاں ڈھونڈھتا ہے ـ اور اب کہ وہ دنیا میں نہیں ہے ، شاید وہ لوگ بھی اُس کی خوبیوں کو دیکھ سکیں ـ جن کی نظریں صرف اُس کی خامیاں ڈھونڈا کرتی تھیں ـــ منٹو نے تو اپنے افسانے "یزید" میں ابنِ معاویہ کو بھی معاف کر دیا تھا ـ فلم سٹار شیام آنجہانی کی باتوں میں منٹو کو

"مُرلی کی دھن" سنائی دی تھی — منٹو کی زندگی
کے سُروں میں ایک آرکسٹرا کا ہنگامہ تھا۔ اب
کہ یہ آرکسٹرا خاموش ہو چکا ہے، آدمی یہی کہہ سکتا
ہے کہ اس کا اختتام یہی ہونا چاہیئے تھا،
ورنہ شاید اس میں ڈرامائی عنصر کم ہو جاتا۔ فنکاروں
کی زندگیوں کے حالات لکھ کر شہرت ڈھونڈنے
والے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ ضرورت سے
زیادہ حسّاس لوگوں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے،
معاشرہ اس کی تائید کرتا ہے — لیکن منٹو
میرا دوست تھا۔ اُسے اور جینا چاہیئے تھا۔
اپنے دوستوں کے لئے، اپنی بیوہ بہن کے لئے
اپنی بھانجی کے لئے، اپنی بیوی کے لئے اور
اپنی تین چھوٹی چھوٹی بچیوں نکہت، نزہت اور
نصرت کے لئے — لیکن شراب اُسے لے گئی۔

مجھے اب بھی یاد ہے جب اُس نے ایک
اُونچے طاق سے ایک آدھا خالی ادھا نکالا
تھا — یہ آج سے کوئی بائیس برس پہلے

کوچہ وکیلاں امرتسر کی بات ہے — اُس نے
بوتل میری طرف بڑھائی، میں نے انکار کیا یہ
ہماری ملاقات کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس کے
بعد (بمبئی کے چند سال چھوڑ کر) ہمیں اکثر اکٹھے
رہنے کا اتفاق ہوا، لیکن اُس نے مجھے اپنی
عادت میں شریک ہونے پر کبھی مجبور نہ کیا۔
ہاں جب لکھنے پڑھنے کا سوال ہوتا تو وہ کبھی
نہ بخشتا...... ہمیں لکھنے پڑھنے کی لت باری علیگ
نے لگائی — مجھے، حسن عباس کو اور منٹو کو۔
عباس اب لکھنا پڑھنا ترک کر چکا ہے اور
کراچی کی ایک فرم میں ملازم ہے۔ منٹو کی موت
کی خبر سنے گا تو جی بھر کے روئے گا۔ منٹو عباس
کا لنگوٹیا تھا — شریف پورہ امرتسر کے
مسلم ہائی سکول میں ان کی شرارتیں داستانِ امیر حمزہ
سے کچھ ہی کم ہوشربا ہوں گی۔
شرارتوں اور شوخیوں کا وہ مجسمہ اب
بے جان پڑا ہے...... اس کی آنچ جب

تخلیقی کاوشوں کی طرف مائل ہوئی تو اُردو ادب
کا دامن بھر گیا اور منشی پریم چند کے ان کرداروں
کی بجائے، جن کی فوری کایا کلپ ہو جاتی تھی،
سچ مچ کے کردار اپنی تمام انسانی خصوصیات
سمیت ادب کے اوراق پر اُبھرے ——
منٹو قارئین کو اُن مقامات پر لے گیا جہاں لوگ
چوری چھپے جایا کرتے تھے۔ اُس نے ان
کرداروں کو جن سے کوئی دن کے اُجالے میں
اپنی جان پہچان کا اشارہ تک نہیں کرتا تھا،
فلڈ لائیٹس میں لا کھڑا کیا اور کہا: انھیں دیکھو،
پہچانو —— تم انھیں جانتے ہو، یہ بھڑوے،
یہ دلال، یہ کلال یہ رنڈیاں، یہ قاتل، چور،
خونی، لچے، لفنگے —— یہ انسان ہیں یہ بھی
انسانوں کی طرح دکھ درد، ذلّت عزّت
سب کچھ محسوس کرتے ہیں - ان کے پہلو میں
بھی گوشت پوست کا دل دھڑکتا ہے۔ یہ بھی
محبّت، نفرت اور حقارت کے احساسات

سے آگاہ ہیں — ان کا احترام کرو اور سوچو
کہ اگر یہ ذلیل ہیں تو کیوں ذلیل ہیں؟ انھیں گالی
دیتے وقت یہ سوچ لو کہ تم گنبد میں کھڑے
ہو۔ ان پر پھٹکار بھیجتے وقت ذرا اپنا منہ بھی
آئینہ میں دیکھ لیا کرو۔

لیکن میں اس وقت افسانہ نگار منٹو کے
وکیلِ صفائی کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا
— منٹو میرا دوست تھا۔ آج وہ دنیا میں
نہیں ہے۔ اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اس
کے بارے میں آپ سے باتیں کروں۔ اور
سچ پوچھیے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں
کیا کہوں —

وہ بڑا سخت جان انسان تھا — بے رخی
بیماری، تنگدستی۔ اُس نے سب کچھ دیکھا لیکن
ہمت نہ ہاری اُس کے قریب ترین رشتہ داروں
نے اُسے آوارہ کا لقب دیا اور اپنے بچوں
کو حکم دیا کہ اُس کی صحبت سے بچو۔

۔۔۔۔۔۔اُس نے مجھے بمبئی سے ایک
خط میں لکھا تھا کہ یہاں آؤ اور دیکھو کہ زندگی سے
کندھا رگڑنے میں کتنا مزہ ہے — اُس کی
اپنی زندگی اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔۔۔۔۔
اُسے اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا۔ میں
کشمیری نہیں لیکن وہ اپنے گھر والوں سے کہا کرتا
تھا کہ سعید کشمیری ہے۔ ورنہ یہ میرا دوست
نہیں ہو سکتا تھا — آج میرا دوست دنیا میں
نہیں ہے — میں اُس کی کون کونسی باتیں آپ
کو بتاؤں۔۔۔۔۔

یہ میری تقریر کا اقتباس ہے جو ۱۹ ارجنوری ۱۹۵۵ء کی شام کو ریڈیو پاکستان پشاور سے منٹو کے تعزیتی پروگرام میں براڈکاسٹ ہوئی۔ آج مجھے اور بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں۔

آزادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد ہوا تو میں لاہور میں تھا اور سعادت بمبئی میں۔ نجات کی خوشی میں غلاموں نے اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا کر چراغاں کیا۔ اور اِس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں ہوگا یا ہندوستان میں، آدھا شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔ اِس جشن کے ناٹک کا

جب پہلا سین ختم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ جاؤ اور جو کچھ لا سکتے ہو لے آؤ — لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فرید میں ہی روک لیا۔ یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقہ میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا: ”وہاں جانا خطرناک ہے۔ اغلب یہی ہے کہ تم راستے میں ہی دھر لیے جاؤ گے — ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آ گئی تو شاید کچھ اُدھر جانے کا بندوبست ہو سکے“ لیکن مسلم لیگ کی لاری نہ آئی۔ میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا: ”کیا کٹڑہ جیمل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟“ جواب ملا۔ ”ہاں — لیکن صرف شہابے شیر فروش کی دوکان تک۔“ اُس سے آگے ہندوؤں کا راج تھا۔ میں نے یقین دلایا کہ میں شہابے کی دوکان سے اِدھر ہی رہوں گا اُدھر نہیں جاؤں گا — کٹڑہ جیمل سنگھ، دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر برلن کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس سنسان کھنڈر میں صرف ہمارے قدموں کی آواز گونج رہی تھی — شہابے کی دوکان سے اِدھر، کوچہ وکیلاں کے سامنے ملبہ کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اسی گلی میں منٹو کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر ملبے کا ڈھیر، مجھے اپنے ماضی اور حال کے درمیان آئرن کرٹن کی طرح آویزاں نظر آیا، جس کے اُس پار دیکھنا محال تھا — لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا: ’یار زندہ صحبت باقی!‘ — میں نے اینٹ پتھر کے اُس انبار کی طرف سے منہ پھیر لیا جو کوچہ وکیلاں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ’آؤ چلیں — ‘ لیکن آج کہ میرا دوست دنیا میں نہیں ہے ملبے کا

وہ ڈھیر آپ سے آپ اُٹھ گیا ہے۔

کوچۂ وکیلاں، منٹوؤں کا محلہ تھا —— سعادت کہا کرتا کہ "منٹ" کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہمارے ابّ و جد کے یہاں دولت ترازو سے تلتی تھی۔ اسی رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔ میں نے منٹو کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی —— دوستوں کو آدمی کچہریوں اور تھانوں میں نہیں لئے لئے پھرتا بعینہٖ جس طرح چاہنے والا محبوب کے خد و خال کو کتابی معیاروں کے مطابق مسطروں سے نہیں ناپتا۔ لیونارڈو نے اگر مونا لزا کے ہونٹوں کو شیشۂ محدّب سے دیکھا ہوتا تو مصوّری کی دنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی —— ہاں، تو کوچۂ وکیلاں منٹوؤں کا محلّہ تھا۔ گلی میں قدم رکھتے ہی دائیں طرف مسعود پرویز کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ اس سے آگے خواجہ عبد الحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔ اس مکان کے سامنے ایک حویلی تھی۔ خواجہ عبد الحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہوگی۔ وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ اُنھوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا "کس کے بیٹے ہو؟" میں نے بتایا تو اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں —— "ارے ارے ارے، تو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اُٹھ کر شہر آئے تھے تو شروع شروع میں یہیں تو لیا تھا مکان۔ ہمارے گھر کے سامنے جو

حویلی ہے نا۔ لسّی منگوایا کرتے تھے ہم تمھارے گھر سے ۔ او ہو ہو ہو۔ کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے ......" اس حویلی کے سامنے، شمال کی طرف، سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کو کھلتا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں دارالاحمر کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی، دیوار کے ساتھ دو کھوکھے، رکھ کر اُن پر گدّا اور گدّے کے اُوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے، شمالی دیوار کے ساتھ، کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی سی الماری تھی۔ جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں، میز پر دیوار کے سہارے پڑی رہتیں۔ میز کے بائیں جانب آتشدان تھا جس پر بھگت سنگھ کا بُت رکھا رہتا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف تیل کا ٹیبل لیمپ تھا اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسیور۔ ایک پبلک ٹیلی فون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اُسے مطلوبہ نمبر نہیں مل سکا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کو کھینچ کر اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ "یہ کیا فراڈ ہے"۔

اُس نے خود اپنے لیے بھی کئی بار 'فراڈ' کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن یہی ایک چیز تھی جو اُسے نہیں آتی تھی۔ اُس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شفّاف آدمی تھا۔ اُس اُجلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں

کے پاس بچھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار ۱۹۳۱ء میں گیا — میں اُن دنوں ہندو سبھا کالج میں سائنس سٹوڈنٹ تھا اور سعادت آرٹس سٹوڈنٹ۔ ایک روز میں نے اُسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اُس نے سرخ دھاریوں کی بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی اور سفید بوسکی کا پاجامہ۔ پاؤں میں چپل تھی، اور قمیص کے اُوپر اونچا سا (فیشن کے مطابق) گرم کوٹ۔ وہ میرے ایک ہندو ہم جماعت پرکاش کی تصویر اُتار رہا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر کالج کے 'فارسی داں' سینیئر "بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را" کے 'حال' میں مبتلا ہو جاتے اور مصرعِ اولیٰ کے "اگر" کی خاطر ہاکیوں سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کو تیار نظر آیا کرتے۔ پرکاش کو منٹو کے کیمرے میں اترتے دیکھ کر تصویر و مصور دونوں کو چشمِ حسود نے گھیر لیا۔ میں نے منٹو کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ "یہ کون ہے؟" میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا۔ جواب ملا "ٹامی!" میں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول، محلے اور پھر کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اُس کی شرارتیں تھیں — خیر یہ 'ٹامی'، جو اُس وقت گویا پری کو شیشے میں اُتار رہا تھا، مجھے کچھ عجیب نرالی وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی معقول آدمی بوسکی کے پاجامے اور لال دھاری کی قمیص، گویا 'نائٹ سوٹ' میں کالج بھی آ سکتا

ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات گئی آئی ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی تصویر کی انیلارجمنٹ کے لئے میں عاشق علی فوٹو گرافر کی دوکان پر گیا، جس کے نام کا اُن دنوں بہت چرچا تھا۔ اُس کے پاس ایسے ایسے کیمرے تھے جو ہمارے شہر کے فوٹو گرافروں نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی گھوم آیا تھا اور اُس کے شوکیس میں فلمی ستاروں کی تصویریں، روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار کی بہ نسبت اُسے اپنے آرٹ کی زیادہ فکر تھی۔ اُس کے سٹڈیو میں گاہک کی تسلّی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر ایسی تصویریں بھی پھاڑ ڈالتا جو گاہک تو خوشی سے لے جاتے۔ لیکن وہ تصویر ہی کیا ہوئی کہ مصوّر کا اپنا جی خوش نہ ہو۔ وہ اعلانیہ شراب پیتا تھا اور اُس کا نوکر چھپ چھپ کر اُس کی سپرٹ۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تین تصویریں بنائیں اور پھاڑ ڈالیں۔ "کچھ بات نہیں بن رہی یار۔" بات بنانے کے لئے وقت درکار تھا۔ اِس لئے میرا اکثر وہاں پھیرا رہتا۔ یہیں ٹامی سے میری ملاقات ہوئی۔ "کیسے پر کاش کی تصویر کیسی آئی؟" میں نے پوچھا۔ جواب ملا: "فلم ہی کب تھی کیمرے میں!"

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مارکین ڈیٹرخ

کی ٹانگوں پر مرتا تھا اور میں گاربو کے حسنِ اُداس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ جس مقام پر میں اب پہنچا تھا، وہ اُسے "چار برس پیچھے" چھوڑ آیا تھا —— وہ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ میں مئی ۱۹۱۶ء میں —— خیر فلمی ستاروں کی کشش اُن کے دو مفلوک الحال غائبانہ عشّاق کو دنوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالبؔ نے کہا تھا ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، جو تھا رازداں اپنا

لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے 'ذکر اُس پری وش کا'، رقیبوں کو رازداں بنا دیتا ہے۔ منٹو سے اپنی دوستی کے لیے میں گریٹا گاربو اور مارلین ڈیٹرخ کا احسان مند ہوں۔ اُن کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوچہ وکیلاں میں لے گئی ہال روڈ سے امرتسر کے فاصلے آنکھ جھپکنے میں طے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس الماری میں رنگارنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اُس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بچھا دیا اور کہا کہ جونسی تصویر چاہو لے سکتے ہو۔

ہم نے چیدہ چیدہ تصویروں کو فریم کروانا شروع کیا۔ فریم کے لئے اُن دنوں بائینڈنگ پیپر نیا نیا چلا تھا۔ فلمی قسم کی فوٹوگرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں رواج دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا —— ہال روڈ کی

پنڈلیاں، اُس پر کوڈک کی گوٹ ۔ نتیجہ آپ خود تصوّر کر لیجیے ۔۔۔۔۔
لیکن یہ عشق ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود بائینڈنگ کریں گے۔ مگر گوٹ اب بھی مہنگی تھی۔ منٹو کو سوجھی کہ پیسٹل پیپر آزمانا چاہیے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا اُن دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے اُنھیں نہیں دیکھا تھا۔ اُن کی ایک بڑی سی تصویر، بھگت سنگھ، مارلین ڈیٹرخ اور جون کرافورڈ کے سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی ۔۔۔۔ بند کالر کا کوٹ، سر پر کشمیری وضع کی پگڑی۔ خشخشی ڈاڑھی، بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید اُن کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لیے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا اُن دنوں وہ میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا: "میاں جی اللہ بخشے بڑے سخت گیر آدمی تھے۔" سعادت کی بہن بتا رہی تھیں "جان خطا ہوتی تھی اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اڑا رہا تھا ایک روز کوٹھے پر۔ میاں جی آ گئے اتنے میں باہر سے۔ چھت سے کود پڑا یہ برابر کے کوٹھے پر ۔۔۔۔ لیکن کیا مجال ہے جو 'سی' تک کی ہو" ۔۔۔۔ وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔ رحم کی التجا کرنے والوں سے اُسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں

کے سروں پر بھی آن گرا۔ لوگ بھنّاتے، جھلّاتے، گالیاں دیں، قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ لیکن منٹو نے کہا۔ مجھے بھی پتنگ اُڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اُس کے سر پر کود جاؤں گا۔ جو میرے پتنگ پر کانٹے، پھینکے گا میں اس کی کھوپڑی پر مٹی کی اینٹ ماروں گا ــــ معاشرے سے اِس کھیل کے دوران میں اُس نے متعدد چوٹیں کھائیں لیکن رحم کی درخواست کبھی اُس کی زبان پہ نہ آئی۔ وہ داد طلب تھا، فریاد کی لے سے اُس کے لب ناآشنا تھے۔

اُس کے والد منصف تھے۔ اُنھوں نے دو شادیاں کیں سعادت کی والدہ، اُن کی دوسری بیوی تھیں منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ اُن کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور اُن کی دو اولادوں ــــ سعادت اور اُس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لئے کچھ باقی نہ بچا ــــ تلخ یادوں کے سوا ــــ منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ گھلی ہوئی ہے جیسے قند کی گولیوں میں یکایک کونین کا ٹکڑا آجائے۔ یہ تلخی کتنی دیرپا تھی۔ اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہوسکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اُس سے انصاف نہ کرسکا۔ اخلاق کے ٹھیکہ دار اُسے عمر بھر کچہریوں میں کھینچے پھرے کہ یہ عریاں نویس ہے، فحش نگار ہے۔ یہ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ اُنھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے

تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدمؑ سب سے پہلے تماشبین تھے (نعوذ باللہ)
بیکو مٹھو کے ہاں جنسی تلذذ تھا ہی کہاں۔ اُس نے قوام کی گولیاں کبھی نہیں
بیچیں۔ اُس کی دوکان میں کوئین تو ضرور تھی کوکین نہیں تھی۔ اُس کا منہ کڑوا تھا
کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کے لیے اُس نے اور کڑواہٹ اپنے
اندر اُنڈیلی۔ بوتل کو منہ لگا لیا ؎

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیٔ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا۔
شراب سے اُس کا جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ ۵۳ء کے اواخر میں وہ مرتے مرتے
بچا۔ ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا اور کہا۔ "سال یا دو سال اور۔ اور اگر
اب بھی نہ چھوڑی تو —" لیکن اُس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا گلاس کی بھی
ضرورت محسوس نہ کی۔ اُس کی تھکی ہوئی رُوح کو سبُو سے ساغر تک، فاصلہ بھی
بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ بلّور کا پردہ بھی برداشت
نہ کر سکی۔ رہگذرِ زیست کا تھکا ہوا راہی جس پہ معاشرہ نے قدم قدم پہ سنگباری
کی تھی۔ جلد از جلد اُس منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں درد کو "لذّتِ سنگ"
کے نام سے نہیں بہلایا جاتا۔ جہاں چٹانیں نہیں ہوتیں۔ پتھروں کے سوداگر
نہیں ہوتے! ۱۸ر جنوری ۵۵ء کی صبح کو اُس کی طبیعت یکایک بگڑ گئی

اُسے خون کی قے آئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ ایمبولینس کار اُسے واپس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سائے میں جیا اور صلیب کے سائے میں جان دے دی ـــ مئی ۵۳ء میں کراچی سے پشاور آتے وقت جب میں اُس سے ملنے گیا تو وہ لمحہ بھر کے لئے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔ اُس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اُس کی بہن نے کہا: "سعادت! سعید آیا ہے۔" اُس کا چہرہ چمک اُٹھا اور آنکھیں جو کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں، یکایک میرے چہرے پر اُتر آئیں ـــ" "آ آ آ۔ خواجہ......" میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اُس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے۔" اُس کی پھٹی پھٹی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں کہ تو بھی ناصح بن گیا۔ اسی سے بھاگ کر تو میں نے یہاں پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی!

اُس کی بڑی بڑی بے چین آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ ایک زمانے میں اُسے پنجاب کی دیہاتی بولیاں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا۔ جنھیں وہ اپنے جاننے والوں کے سامنے اکثر دوہرایا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شاعری فراڈ تھی۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شعر اُس نے کس کس کو نہیں سنایا ہوگا۔

گورا رنگ تے شربتی اکھیاں

نی میں گھنڈ وچ ڈک ڈک رکھیاں

اُس کی آنکھوں میں بھی یہی شربتی کیفیت تھی۔ سگرٹ کے دھوئیں کے پیچھے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیلیں دکھائی دیتیں جن کی تہ میں نہ جانے کتنی حسرتوں کے سفینے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اُس محبّت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہوگیا تھا۔ اُس کے دوستوں کا خلوص اور مداحوں کی قدردانی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے ———

بھگت سنگھ کے بُت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر میری چشمِ تصوّر میں اُبھر رہی ہیں۔ اُن خشمگیں نگاہوں کے سائے میں پھر بڑی مصروفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہاں موضوعِ گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کے بجائے ادب و انقلاب زیرِ بحث ہیں۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک بھاری آدمی کارلائل اور گبن کے اندازِ تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ تین نوجوانوں کے تمتماتے ہوئے چہرے اُس کی تاثیرِ سخن کے شاہد ہیں۔ کمرے کی فضا ایکٹرسوں کے قصیدوں کے بجائے والٹیر، روسو، ڈانٹن، نپولین، مارکس، لینن، ٹراٹسکی سٹالن اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہے ——— اس بزرگ کا نام باری علیگ ہے۔ اُس کے مریدوں کے نام: سعادت حسن منٹو، حسن عباس اور ابوسعید قریشی !!!

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی محسوس ہوتا ہے

جیسے میں اُنھیں ہمیشہ سے جانتا تھا ـــــ بہر حال یہ منٹو سے ملاقات سے کے بعد کی بات ہے۔ اُن سے ہمارا تعارف علم و ادب سے تعارف تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدنے لگے۔ متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچنے لگے ـــــ دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں لطف آنے لگا۔ مستبد حکمرانوں کا تختہ اُلٹنے والوں کے آئینوں میں ہمیں اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ ہم نے اپنی چشمِ تصوّر میں امرتسر کے گلی کوچوں کی بارہا مورچہ بندی کی اور 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے' انھیں رودبار انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لے گئے' یاجوج ماجوج کی طرح قید کر دیا تاکہ پھر دنیا کو تاخت وتاراج نہ کر سکیں۔ اور عظمتِ افرنگ کے لازوال آفتاب کو تانبے کے پرانے پیسے کی طرح گردش سے نکال پھینکا۔ انقلاباتِ روس و فرانس کی داستانیں بچّوں کی کہانیاں بن گئیں۔

"اب سوچا جائے تو اُس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اُس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے اُن سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب

یعنی باری اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم

چاروں اُس زمانے میں ان کھلونوں سے

اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے

اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں

کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوصِ دل

سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے

اُس جوش کے رُخ کا بھی صحیح علم نہیں تھا۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم

بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو ڈرتے

رہتے تھے کہ توند نہ نکل آئے۔ حالانکہ خاقوں

کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصّہ بڑھتا رہا۔

زیادہ تیز نہیں بھاگتے تھے کہ اُن کے دل پر

اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ اُن کے جسم کے

اسی رئیس عضو نے اُن کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی

بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے

تھے اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے

تھے —— اشتراکی ادیب باری تمام عمر اپنی

زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جماتا رہا۔ لیکن
وہ اُن کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو
اُس کے وزنی سر میں پرورش پاتے تھے"۔

(باری صاحب۔ از منٹو۔ مجموعہ گنجے فرشتے)

اگر ہمارا مُرشد بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشدان پر بھگت سنگھ کے بُت کے سائے میں چار ایسے بچے کھیل رہے تھے۔ جن کے مجسمے۔ ڈانتن، روبس پیری، میزنی، لینن اور ٹراٹسکی کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے رُخی، بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اُسے ہوا دی اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا۔ اُس کے قلم کی روشنائی لاوا بن کر بہ نکلی۔ جن لوگوں کے گھر اُس کے راستے میں آئے، وہ چیخ اُٹھے۔ اُنھوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا، مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے لیکن لاوا نہ رُکا۔ آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدّت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی سُوکھ گئے ــــ وہ آتش فشاں پہاڑ اب خاموش پڑا ہے۔ اُس کی آگ سے ڈرنے والے اب اُس کے دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت زرخیز ہوتی ہے۔

منٹو پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا آج ہر کوئی اس کا شناسا سا ہے۔ ہر کسی کو اُس کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اُس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اُس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جمالیاتی کسوٹیوں پر کسا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پہ دو صفحے سیاہ کر دیئے ہیں۔ ایک نے اُس کا موازنہ موپاساں سے کیا ہے ایک اور بزرگ نے اُسے سمرسٹ ماہم کا رتبہ دیا ہے...... ان تعزیتی تحریروں میں حفیظ ہوشیار پوری کے ہاں سب سے مجھے بہت خلوص نظر آیا ہے۔

"منٹو کی زندگی موت اور اُس کے فن کے

بہترین ترجمان، اُس کے محبوب شاعر غالب

کے یہ اشعار ہیں:"

جز دو رائیٹہ ندیدم اثرِ سعیِ خیال

ہر قدر بہرِ طلبگاریِ انساں رفتم

سازِ ہنگامہ نہ اندر خورِ طاقت کردم

راہِ مستی نہ بہ اندازۂ ساماں رفتم

تا سبک، روحیِ من رنجِ گرانی نہ کشد

شب وصلی شدم و زدہ دپایاں رفتم

نگہم نقدِ بہ گنجینۂ ولہا می زد

مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

حفیظ نے آگے چل کر لکھا ہے :-

"اُس نے اپنی تاریخِ وفات کی فرمائش کی
تھی۔ آج میں اِس فرض سے سبکدوش ہو رہا
ہوں۔

چوں سعادت ز جہاں رفت ہمی گفت حفیظ
تشنہ از خمکدۂ عالمِ امکاں رفتم
خواند ایں مصرعِ تاریخ ز غالب با آہ (۶)
مژدہ باد اہلِ ریا را کہ ز میداں رفتم!"

۱۳۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

اپنی نوکِ قلم سے وہ عمر بھر ریاکاری کے پیرہن تار تار کرتا
رہا۔ ان میں ایک پیرہن مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے
ملک میں راسپوٹن کے بھی باپ بستے ہیں۔ جلالت مآب بزرگ، جن کی شرعی
داڑھیوں، نورانی چہروں، مقدس دستاروں، بے داغ عباؤں اور دوررس
نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام اِن
کے دامِ فریب میں اس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں
کی مرادیں پوری کرتے ہیں، راکھ کا سونا بناتے ہیں۔ ان کی خاکِ پا لاعلاج مریضوں
کا علاج ہے۔ اِن کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔
ان کی دوکانوں پر حُب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب

رام ہوں۔ ان کے کالے علم سے دشمن زیر ہوں اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچہ دیں اور کنواریوں کے آسیب اُتاریں ـــــ منٹو کا 'صاحب کرامات' (مجموعہ: سڑک کے کنارے) بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو سادہ لوح کسان کو، جو جلد بازی میں اپنی بیوی بھاگاں کو طلاق دے چکا لیکن اب اُسے دوبارہ بسانا چاہتا ہے، جل دے کر پہلے اُس کی کنواری بیٹی جیناں اور پھر اُس کی بیوی بھاگاں (لڑکی کی ماں) کو نشہ پلا کر اپنے جلال کی آگ بجھاتا ہے۔ اُس کے کندھے پر زرد رومال ہے (جو حاجی لوگ تحفتہً لاتے ہیں) اُس کی لال لال آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے۔ ''دراز ریش بزرگ۔ لمبے لمبے پٹے۔ اُن کے اور داڑھی کے بال کھچڑی ...... ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والا عصا ...... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے اُٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا اور موجو سے کہا ـــ چودھری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اُٹھا۔'' لیکن اُس روز جیناں کا نصیبا سو گیا۔ رہی بھاگاں؟ وہ مطلقہ ہے اور مولوی فرماتے ہیں۔ ''جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے ــــــــــــ اور پھر اُس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے اُس سے طلاق لے، پھر جائز ہے۔ ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کڑی سزا نہ دی جائے ـــ موجو چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے

ارشاد ہوا (خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے) —— تو ہم اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لئے تو اُس سے نکاح کرلے۔ دوسرے دن طلاق دے کر موجو کے حوالے کردے...... مولوی صاحب نے کنڈی بند کردی اور پھاتاں سے کہا۔ تم آج کی رات میری بیوی ہو......"

صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی داڑھی اور پٹے بستر پر تکیے کے نیچے چھوڑ گئے —— "منٹو کا یہ خاص پینترا ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر ہمارے یہاں اکثر ایسے جرائم کئے جاتے ہیں۔ مہذب اخبار ایسی خبروں کو گول کر جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی آنکھیں تہذیب کی سطح کو نہیں اُس کی تہ کو دیکھتی ہیں۔ وہ چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوتا۔ کیمیا گر دھات کی ماہیت اور اُس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ملمع سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اُس کی بھٹی میں کھوٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اُسے کٹھالی سے نکال کر دوکاندار کے منہ پر دے مارتا ہے کہ یہ لو اپنا سونا! —— اپنی تہذیب! منٹو اپنی تحریروں میں اپنے خاص ڈرامائی انداز سے جگہ جگہ معاشرے کی جعلی داڑھیاں نوچتا نظر آتا ہے کہ یہ لو اپنا میک اپ! —— اس میک اپ کے پردے سے کبھی "گنجے فرشتے" اپنی تمامتر عریانی سمیت نمودار ہوتے ہیں اور کبھی شیاطین جو حوروں کو ورغلا کر لاتے ہیں اور انھیں چوک میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا چاہتی ہیں لیکن وہاں رضوان کھڑا ہے۔ جنت کے دروازے اُن پر بند ہو چکے ہیں۔

چودہ سو سال کی بت شکنی کے بعد بھی لات و منات دنیا میں موجود ہیں۔

اقبالؔ نے کہا تھا:

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

منٹو کا فن اسی فلسفۂ حیات کا ترجمان تھا۔ اقبالؔ نے شکایت کی تھی۔

کارگہِ حیات میں کیا کوئی بُت شکن نہیں
کب سے ہیں منتظر کھڑے دیر و حرم کے سومنات

منٹو اسی سوال کا جواب تھا۔ یومِ اقبال پر منٹو نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا "اقبال نے خدا سے دعا مانگی تھی — مرا نورِ بصیرت عام کر دے — یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی، ضرور قبول ہو گی......" منٹو اس وقت بھول گیا تھا کہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی"۔

لیکن محمود و ایاز کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کلیمؔ کے ساتھ آذر کا نام بھی ضرور آئے گا۔ بُت شکن منٹو نے اپنے خاک و خون سے اپنے نحیف و ناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بُت بنائے اور اُنھیں اولادِ آدم کے سامنے خالی شہ نشینوں اور طاقچوں میں چُن دیا —

"بابو گوپی ناتھ اور "ممی" کی مورتیوں میں مجھے آدم و حوا کا عکس نظر آتا ہے۔ اُن کا گناہ آدم و حوا کا گناہ ہے لیکن اُن کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں۔ منٹو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اُن کا خمیر کس مٹی سے اُٹھایا گیا تھا۔ منٹو

کسے مذہب میں انسان اپنے بارِ عصیاں کے باوجود انسان ہے۔ مسجودِ ملائک!
اِن بُتوں کا خالق، اِن کے آستانے پر اپنا سر جھکانے کو کفر نہیں گردانتا۔
غالباً یہی وہ لوگ ہیں۔ جنھیں اقبالؔ نے ــــ "آدمِ خاکی نہاد، بندۂ مولیٰ صفات"
کا نام دیا تھا۔ اِن سے مجھے "میلادِ آدم" کی یاد آتی ہے۔ منٹوؔ نے اپنے
کتبہ میں لکھا ہے۔ "یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے...... وہ اب بھی منوں
مٹّی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا"۔ کیا ہم اسے
اتنے بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے؟

وہ کشمیری تھا۔ جرم و عصیاں کے آتشکدوں سے وہ اُن قدیم عورتوں،
کی طرح جو ریل کی پٹڑیوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں، یاس و حرماں کی راکھ
میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چُن چُن کر 'اپنی کانگڑی' بھرتا رہا تاکہ رسوم
و قیود کے پالے کی ماری ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کر سکیں۔ 'سدراج' کی
سردمہری، 'بسم اللہ' کی اُداس آنکھوں اور 'شاردا' کے سگریٹ کے ڈبے
میں اس آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔ 'سڑک کے کنارے' کے چولھے
"جن پہ بن بُلائے مہمان کی خاطرداریاں چڑھی ہیں"۔ اسی اَن دیکھی آگ سے
گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں یہی 'کانگڑی' چھپائے ہوئے
ہے...... وہ خود بھی اسی پالے کا شکار تھا۔ اُس نے پرومیتھیس ـــــ
(Prometeous) کی طرح دیوتاؤں کے آستانے کی آگ چرالی۔

اِس جرم کی پاداش میں اُسے چٹان سے باندھ دیا گیا اور محاسبہ کے گِدھ اُس کا جگر نوچنے لگے۔ آگہی سب سے بڑا گناہ ہے ـــــ منٹو کا آتشدان اِسی آگ سے روشن ہے۔ لیکن اُس کے اُوپر بھگت سنگھ کا بُت کیا کر رہا ہے؟ تخریب و تخلیق شانہ بشانہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ دست بریدہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا۔ باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے۔ اُنھیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے بُرے کی پہچان نہ بتا سکتے۔ ذوقِ سلیم نے مدد کی اور دارالاحمر میں وکٹر ہیوگو، لارڈ لٹن، گورکی، چیخوف، پوشکن، گوگول، دوستوفسکی، اندریف، اوسکر وائلڈ اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ وکٹر ہیوگو باری صاحب کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا نادلسٹ تھا۔ ہم نے اُس کی تصانیف دور دور سے منگوائیں۔ اور اُنھیں درسی کتابوں کی طرح پڑھا۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اُس کی LESS MISRABLE کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اُس کی ضخامت دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ منٹو نے اسے سرگذشتِ اسیر کے عنوان سے LAST DAYS OF A CONDEMNED کا ترجمہ کر دیا۔ یہ کتاب "سزائے موت" کے خلاف پُرجوش احتجاج ہے ـــــ مصنف صاحب

کا چھوٹا بیٹا ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ آسکر وائیلڈ کی "ویرا" کا ترجمہ بھی اِسی دور کی یادگار ہے۔ منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے "یہ ڈرامہ روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود تھے۔ امرتسر میں اُن دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو توپ دم کر دیا جاتا۔" چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو "مستبد حکمرانوں کے عبرت ناک انجام! روس کے گلی کوچوں میں صدائے "انتقام" کی خبر دی گئی اور "زاریت کے تابوت میں آخری کیل" گاڑا گیا تو کوچہ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان چیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہیت کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن خواجہ عبدالحمید صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی نے پولیس کے سیفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ وہ تو اپنے بچے ہیں میاں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور بلا ٹل گئی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تندہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ اُس کا افسانہ "تماشا" (مجموعہ: "منٹو کے افسانے") انہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے اس میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگامے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا

ہے۔اس کا ہیرو خود منٹو ہے۔اُس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔قانون کی "بے اعتنائی" نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔عزیزوں کی بے اعتنائی کیا کم تھی کہ وہ اِدھر کا رُخ کرتا۔اس کے علاوہ اُسے پٹے ہوئے راستوں سے نفرت تھی۔لیڈروں کی خود غرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی۔وہ خلوص کا بھوکا تھا لیکن اُن لوگوں میں خلوص کہاں تھا! وہ چیخ اُٹھا: "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ!"

"ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک
کی فضا بگاڑ رہے ہیں ...... یہ نام نہاد لیڈر
اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے
پھرتے ہیں۔جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر
روپیہ جمع کرتے ہیں .... اِن کے ہر سانس
میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفّن محسوس
کرتے ہیں۔لمبے لمبے جلوس نکال کر،منوں بھاری
ہاروں کے نیچے دب کر۔چوراہوں پر طول طویل
تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد
راہنما اپنے لئے راستہ بناتے ہیں جو عیش و عشرت
کی طرف جاتا ہے ...... یہ لوگ چندے اکٹھے
کرتے ہیں مگر کیا انھوں نے آج تک بے کاری کا

حل پیش کیا ہے...... یہ لوگ جن کی روح لنگڑی،
دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں،
ملک و ملّت کی راہبری کیسے کر سکتے ہیں......
ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں۔
صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا
سا اخلاص رکھتا ہو۔ جس کے سینہ میں اتاترک کا
"سپاہیانہ جذبہ ہو......"

(منٹو کے مضامین مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

یہ مضمون، جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے، آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منٹو کی زندگی میں بمبئی کے پہلے دور کی پیداوار ہے۔ دارالاحمر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلّق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دنیا کے بارے میں اُس کا کیا ردِّ عمل تھا۔ اسی مجموعہ میں، آگے چل کر اُس نے اپنا حال اور واضح کر دیا ہے:

"سیاسیات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں
اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار
کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے
ہیں...... خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے

اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سینما سے۔

گاندھی جی سینما نہیں دیکھتے، میں اخبار نہیں پڑھتا۔

اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو

فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور

پڑھنے چاہئیں۔

("باتیں"۔ منٹو کے مضامین)

بادی النظر میں یہ چند سطور 'شوخیٔ تحریر' ہیں اور بس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فلموں کا بُعد لیڈروں میں "ذہنی توازن" اور SENCE OF THOUGHT کے فقدان کا نشان ہے۔ گاندھی جی اور فلم محض علامتیں! سعادت نے اپنے خاص منٹوی انداز میں ایک 'حقیقت' سے دوسری 'حقیقت' کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو اُبھارنا، طنز کی خاص ٹیکنیک ہے۔ منٹو اس کا ماہر تھا۔

"وہی بمبئی تھا جہاں کانگریس نے امتناعِ شراب

کا قانون پاس کرکے اُن ہزار ہا مزدوروں کو بیکار

کردیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے۔۔۔۔۔۔ وہی

عروس البلاد تھی، جس کے گھونگھٹ کا ایک

حصہ حریری ہے اور دوسرا کھردرے ٹاٹ کا

—— وہی بمبئی جہاں اونچی اونچی خوبصورت
عمارتوں کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزاروں
مخلوق رات کو سوتی ہے۔"

"مسلم لیگ مسجد ہے، کانگرس مندر ہے کانگرس
سوراج چاہتی ہے، مسلم لیگ بھی۔ لیکن دونوں
رل مل کر کام نہیں کر سکتے...... ان کے خون
کا ملاپ موریوں اور بدروؤں میں ہوگا......

(باتیں)

ایسے میں سیاسیات سے اُس کی برگشتگی قدرتی بات تھی —— لیکن میں امرتسر سے بمبئی پہنچ گیا —— جلیانوالہ باغ کے شہر میں۔ ماسکو کا منڈوا اپنے اشتہار کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اُس کی سین سینری، پردے پٹاخے ڈائریکٹر کے گھر میں منتقل ہو گئے اور بعد میں کباڑ کے بھاؤ لاہور کے ایک کتب فروش نے خرید لیے۔ دنگلوں، مویشیوں کے میلوں، منشیات کے ٹھیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشا تھا۔ اور یہ کتاب (ویرا) تو سچ مچ کا ناٹک تھا جس کے لیے لائسنس ضروری تھا۔ لیکن لائسنس نہ ملا اور "پروڈیوسر" بھاگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے!

اُنھیں اس ناٹک کا انجام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ PICTURE OF DORIAN GRAY کا مصنف دہشت پسندی سے اتنا ہی دُور تھا جتنے گاندھی جی سینما سے۔ ناٹک کے اختتام پر ویرا، آسکر وائلڈ کی ہیروئن وہی خنجر جسے وہ زار وچ کے سینے میں گھونپنے کے لئے لائی تھی، اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے ــــ اُسے زار وچ سے عشق تھا۔ محبّت فتحیاب ہوئی فرض منہ دیکھتا رہ گیا۔

لیکن تماشا ابھی ختم نہیں ہوُا۔ "بچوں کا کھیل" ابھی جاری ہے ــــ پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے "پروڈیوسر" باری صاحب، پھر آموجود ہوئے۔ اب کے ایک ہفتہ وار اخبار کے "ایڈیٹر پبلشر" کے "میک اپ" میں۔ اخبار کا نام "خلق" تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے۔ تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ "تماشا" خلق کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلاب انگیز مضمون لکھا۔ "مزدور" جس میں جذباتیت کی تمام خامکاری بدرجۂ اتم موجود تھی اور سرمایہ دار کو خوب موٹے موٹے "مفرس و معرب" الفاظ میں کوسا گیا تھا۔ یہ مضمون "آدم" یا شاید "ابنِ آدم" کے فرضی نام سے شائع ہوُا۔ منٹو نے بھی مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنّف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے ہیگل اور مارکس کے بارے میں اپنے خاص خطیبانہ انداز میں کچھ لکھا، جسے شاید میں آج بھی نہ

سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پیر و مرشد تھے، جن کے روحانی فیض نے ہمیں اپنے تمام ہم عمروں سے ممتاز و ممیّز کر دیا تھا۔ اور تو اور کالج میں ہمارے پروفیسر بھی (جن میں فیض احمد فیضؔ اور صاحبزادہ محمود الظفر جیسے لوگ بھی شامل تھے) ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے۔ ایسے میں ہمارا اُستاد باریؔ کوئی بے معنی اور بے مصرف بات کیوں کر کہہ سکتا تھا۔ مگر اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ ہو، اتنا ضرور ہوا کہ مارکسؔ کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہو گئے لیکن "خلق" اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا اور باریؔ صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔

باریؔ صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے اور انھیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے —— وہ عجیب و غریب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ جذبۂ انقلاب کو جِلا دینے کے لئے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت نے کہا "باریؔ صاحب آپ بکواس کرتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے" لیکن باری صاحب کا خواب خبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "تم دیکھ لینا۔ وہ دن دور نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کرو گے۔" "جیل میں" وہ اپنی ڈائری لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی (مجھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں) رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ لے کر شہر کے بہترین جلد ساز سے کالے مخملی چمڑے کی ایک ڈائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پہ آہنی سلاخوں والے دروازے کی

ایک کٹنگ نہایت نفاست سے چپکائی گئی۔ اِس تصویر کے اُوپر کاتب سے
"دریچۂ زنداں" کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوایا گیا ـــ اشتراکی ادیب بھی
بہت بڑا رومان پسند تھا! اُن کے چیلے، اپنے گورو کی طرح مارکس اور اینگلز
کا چلّہ نہ کھینچ سکے۔ مادہ پرستی کا یہ وظیفہ اُن کی سبک اور نازک روحوں کے لئے
بہت بوجھل تھا۔ اُن کی انفرادیت، اجتماعیت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی ـــ
منٹو کی "انا" ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی۔ مگر "انا الحق" کی منزل ابھی دور تھی۔
"دارالاحمر" میں روسی مصنفین کی کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ "عالمگیر" کے
"روسی ادب نمبر" کی تیاری ہو رہی ہے۔ تنقیدی کتابیں دیکھی جا رہی ہیں۔ مصنفوں
کے حالاتِ زندگی اور روسی ادب کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل
کی جا رہی۔ اُن مضامین اور کہانیوں پر بحث ہو رہی ہے جن کا ہمیں ترجمہ کرنا ہے۔
کون سا مضمون یا کون سا ترجمہ کس کے نام سے شائع ہو گا؟ اس کی کوئی اہمیت
نہیں۔ میرا ترجمہ منٹو کے نام سے چھپ سکتا ہے، منٹو کا عبّاس کے نام سے۔
عباس کا کام مجھ سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔
کام مقدم ہے۔ رسالہ وقت پر نکلنا چاہیئے۔ "عفی عنہ" سے وعدہ ہو چکا ہے
ـــ عالمگیر کے ایڈیٹر اپنے نام کے ساتھ "عفی عنہ" لکھا کرتے تھے ـــ
رسالے کے سرورق کا ڈیزائن مشہور فلم سٹار ایم اسمٰعیل کے سپرد کیا گیا۔ منٹو
اُس کا مدّاح تھا ـــ اور بھاٹی دروازے کے ایک تنگ و تار گلی میں متعدد

تجاویز پر غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ سرورق کا پس منظر سرخ چوک میں لینن کے مقبرے اور کریملن کا ہو۔ پیش منظر شاید ایک روسی حسینہ پر مشتمل تھا۔ اس ڈیزائن کی "مزدوری" پندرہ روپے طے پائی، بلکہ منظور ہوئی — "اتنا مہنگا!" اس سے پہلے "عفی عنہ" نے کسی بھی ڈیزائن کے پانچ روپے سے زیادہ نہیں دیئے تھے — "حد پانچ روپے"۔ منٹو کا تخمینہ شاید تیس روپے تھا۔ اس خاص نمبر کی تیاری میں ہم نے کم از کم سو روپے کے سگرٹ پیئے اور کوئی پچیس تیس کی کتابیں خریدیں۔ باری صاحب گا رہے تھے ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

وز جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب! اے انقلاب، اے انقلاب!"

وہ یہ اشعار اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

روس ہو گیا تو روسو کا ملک کیونکر نظر انداز ہو سکتا تھا۔ اسی نے تو لکھا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا لیکن اسے ہر جگہ زنجیروں میں جکڑ دیا گیا"۔ یہ الفاظ ہمارے پیر و مرشد باری صاحب کے "انقلابِ فرانس" کے پہلے صفحے پر چمک رہے تھے۔ اور پھر خود وکٹر ہیوگو بھی انقلاب کا علمبردار تھا۔ وہ اپنے "۹۳" میں لکھ چکا تھا کہ "تم نے لکھا ہے کہ شمشیر زن سپاہی شاعروں کی طرح لکھتے ہیں۔ تم دیکھ لینا کہ شاعر کس طرح سپاہیوں

کی طرح شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے ہیں"۔ ہیوگو کے علاوہ بالزاک تھا جس نے خرقہ پوش راہبوں تک کو ننگا کر دیا...... پھر موپاساں تھا، جسے منٹو فنِ افسانہ نگاری کا خدا مانتا تھا اور جس کی "مادام تیلیئر کے قحبہ خانے" میں نہ جانے کتنی سوگندھیاں پرورش پا رہی تھیں۔

فرانسیسی ادب نمبر کے لئے "ہمایوں" کو چنا گیا۔ لیکن "عالمگیر" کے ایڈیٹر اور "ہمایوں" کے ایڈیٹر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ "عفی عنہ" اپنے پریس اور رسالے سے روپیہ سمیٹنے کا گناہ بخشوا رہا تھا۔ "حامد علیخاں" ایک ہونہار ادیب کی ہمت افزائی کر رہا تھا۔ اُس کی میز پر دوا فروشوں کے اشتہاروں کے فرموں کی بجائے "لغات" کے انبار تھے۔ وہ خود سو روپیہ مہینہ کا تنخواہ دار تھا۔ اس مخلص نوجوان کی ناداری کا اندازہ لگاتے اُسے دیر نہ لگی۔ اور کام دیکھ کر رسالے کا مالک بھی خاص نمبر کے مرتّب کی "حوصلہ افزائی" پر مجبور ہو گیا۔

یہ سعادت کی زندگی کا بہت نازک دور تھا۔ مالی مشکلات بڑھ رہی تھیں۔ لیکن خرچ کا وہی حال تھا۔ چنانچہ جو کچھ بھی مل جاتا غنیمت تھا۔ اُس کی صحت الگ خراب تھی۔ سینے میں شدید درد ہوتا اور وہ کبھی ٹنکچر آیوڈین ملتا اور کبھی رائی کا پلستر لگائے پڑا رہتا۔ لیکن درد نہ تھمتا۔ تکلیف زیادہ ہوتی تو عینک اُتار کے ایک طرف رکھ دیتا۔ ٹانگیں سکیڑ کر سینے کے ساتھ لگا لیتا اُس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل سی جاتیں اور مصنف صاحب کی تصویر کی آنکھیں

کی طرح غضب آلود ہو جاتیں جیسے کہہ رہی ہیں کہ مجھے تمہارے رحم، کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا درد خود برداشت کر سکتا ہوں۔ ایک دن وہ حسبِ معمول ٹانگیں سینے سے لگائے درد کو دبانے کی کوشش میں اپنے "کھوکھوں" کے صوفے پر لیٹا ہوا تھا کہ اُس کی ایک نہایت ہی قریبی عزیزہ نے اُسے بُلوا بھیجا۔ یہ بلاوا نہایت ہی خلافِ توقع تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ حال پوچھنے کے لئے بلایا تھا۔ "سنا تھا بیمار ہے تو ــــ میں نے کہہ دیا اب اچھا ہوں۔ شکریہ"۔ اور پھر وہ اپنے 'صوفے' پر سمٹ گیا۔ اُس کے پتلے پتلے پاؤں تیزی سے ہل رہے تھے۔ "سگرٹ ہے تمہارے پاس ــــ نہیں سلگا کر دو۔" درد کو دبانے کے لئے اُس نے دیسی پینا شروع کر دی۔ جس کا پوّا دارالاحمر کے اونچے طاقچے میں کیلنڈر کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ یہ طاقچہ منصفؔ صاحب کی تصویر کے اوپر تھا۔ یہاں ان کی غیض آلود آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ دلّی میں بوتل لکھنے کے فرشی ڈیسک کے نیچے پڑی رہتی تھی۔ اور زندگی کے آخری ایام میں، حامد جلال کے بیان کے مطابق وہ اُسے غسل خانے میں چھپائے رکھتا تھا شاید اُسے اب بھی منصفؔ صاحب کی آنکھوں کا ڈر تھا کہ کہیں وہ تعاقب تو نہیں کر رہیں ــــ مگر طاقچے کا کیلنڈر ہل رہا ہے۔ ایک گھونٹ لینے کے بعد بوتل واپس رکھ دی گئی ہے۔ لیکن یہ درد کا علاج نہیں۔ دوائیاں مہنگی ہیں۔ ڈاکٹروں کو دق کا شبہ ہے۔ مریض کو اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً کسی

صحت افزا مقام کا رُخ کرنا چاہیئے۔

اُس نے کشمیر کا رُخ کیا۔ لیکن "بٹوت" کے پڑاؤ پر "بیگو" نے اُس کا راستہ روک لیا۔ وہ ایک نوخیز چرواہی تھی۔ "لذت زار" کشمیر کے سیاحوں کے لئے وہ بھی وادی کی ایک سڑک تھی اور مہاراجہ ہری سنگھ کے بزرگوں کی زرخرید املاک میں ٹول ٹیکس دے کر آنے والا ہر مسافر اُسے دوسری سڑکوں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اُس کے پامال جسم میں منٹو کو ایک پاکیزہ روح نظر آئی۔ اُس کے الاؤ میں اُس نے محبت کی وہ چنگاری دیکھی جسے جگانے کے لئے کسی دردمند کے سانسوں کی ضرورت تھی۔ اور اُسے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ لیکن زادِ راہ ختم ہو چکا تھا اور اُسے واپس امرتسر آنا پڑا۔ اُس کے سینے کا درد پہلے کی بہ نسبت بہت کم ہو چکا تھا۔ وہ اُس کی باتیں کرتا تو اُس پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہم نے اُسے "بیگو" کا نام لے کر چھیڑنا شروع کیا۔ اوچھے سے اوچھے ہتھیار استعمال کئے کہ وہ کھل کر بات کرے "عشق" کے لفظ سے وہ بہت چڑتا تھا۔ ہم نے کہا "تجھے بیگو سے عشق ہو گیا ہے" اُس نے کہا "بکواس نہیں کرو" اُس نے اپنے سینے کے دریچے ہم پر بھی بند کر لئے۔ ہم جو اُس کے ہم مشرب و ہم راز تھے۔ وہ اُس خزانے کو جو اُسے راستے میں پڑا ہوا ملا تھا۔ ہماری نگاہوں سے بھی چھپا گیا۔ وہ اُس جذبے کو جو اس کے دل میں ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ رسوا نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ اور "عشق" تو ہے ہی رسوائی کا دوسرا نام۔
"چعند" کے "ایک خط" کی وزیر کے پردے میں بھی مجھے وہی "بیگو" نظر آ رہی ہے:

"میرا دل درد سے بھرا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں علیل ہوں اور علیل رہتا ہوں جب تک دردمندی میرے سینے میں موجود ہے، میں ہمیشہ بے چین رہوں گا۔ یہ 'دردمندی' میرے لہو کی بوندوں سے اپنی خوراک حاصل کر رہی ہے اور ایک دن ایسا آئے گا جب صرف درد ہی درد باقی رہ جائے گا۔ اور تمھارا دوست دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔....

میری کشمیر کی زندگی! — ہائے میری کشمیر کی زندگی!! مجھے معلوم ہے تمھیں میری زندگی کے اس خوشگوار ٹکڑے کے متعلق مختلف قسم کی باتیں معلوم ہوتی رہی ہیں۔ یہ باتیں جن لوگوں کے ذریعے تم تک پہنچی ہیں۔ اُن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے تمھارا یہ کہنا

درست ہے کہ تم اُن کو سن کر ابھی تک کوئی
صحیح رائے مرتب نہیں کر سکے۔ لیکن میں یہ ضرور
کہوں گا کہ یہ کہنے کے باوجود تم نے ایک رائے
مرتّب کی ہے۔ اور ایسا کرنے میں بہت عجلت
سے کام لیا ہے۔ اگر تم میری تمام تحریروں کو پیشِ نظر
رکھ لیتے تو تمھیں یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہوتی کہ میں
کشمیر میں ایک سادہ لوح لڑکی سے کھیلتا رہا ہوں
۔۔۔ میرے دوست تم نے مجھے صدمہ پہنچایا ہے"
اِس خط کے مکتوب الیہ کو ہم نہیں جانتے۔ لیکن اس کے مصنّف کو اُس
کے "دارالاحمر" کے دوست جانتے ہیں۔
"وزیرہ کون تھی؟ اِس کا مختصر جواب یہی ہو سکتا
ہے کہ وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ جوان اور پوری
جوان!! اس پہاڑی لڑکی کے متعلق، جس نے
میری کتاب زندگی کے کچھ اوراق پر چند حسین
نقوش بنائے ہیں۔ میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔
میں نے وزیرہ کو تباہ نہیں کیا۔ اگر 'تباہی'
سے تمھاری مراد 'جسمانی تباہی' ہے تو وہ پہلے

ہی تباہ شدہ تھی۔ اور وہ اس تباہی میں اپنی
مسرت کی جستجو کر رہی تھی۔ جوانی کے نشے میں
مخمور اُس نے اِس غلط خیال کو اپنے دماغ میں
جگہ دے رکھی تھی کہ زندگی کا اصل حظ اپنا خون
کھولانے میں ہے۔ اور وہ اِس غرض کے لئے
ہر وقت ایندھن چنتی رہتی تھی۔

وزیر کا جھونپڑا سڑک کے اُوپر پہاڑی ڈھلوان
میں واقع تھا۔ میں اُس کی ماں کے کہنے کے مطابق
ہر روز اُس سے ذرا اُوپر چیڑ کے درختوں کی چھاؤں
میں دری بچھا کر لکھا پڑھا کرتا تھا۔ اور عام طور پر
وزیر میرے پاس ہی اپنی بھینس چرایا کرتی تھی۔
ہر روز ہوٹل سے دری اُٹھا کر لانا اور پھر اسے
واپس لے جانا ایک عذاب تھا۔ اس لئے میں
اُسے ان کے مکان میں چھوڑ جاتا۔ ایک روز
مجھے دیر ہو گئی۔ میں جب اُن کے گھر پہنچا اور
دری طلب کی تو معلوم ہوا وزیر دری لے کر
اوپر چلی گئی ہے۔ جب میں اُوپر چڑھا اور اُس پتھر

کے قریب آیا جسے میں میز کے طور پر استعمال کرتا
تھا تو میری نگاہیں وزیر پر پڑیں۔ دری اپنی جگہ
پر بچھی ہوئی تھی اور وہ اپنا سبز کلف لگا دوپٹہ
تانے سو رہی تھی....."

اِس تصوّر سے میرے ذہن میں اُن مزاروں کا نقشہ ابھرتا ہے۔ جن پر سبز غلاف چڑھے ہوتے ہیں۔ اِس خاص قبر میں جو زمین کی سطحِ تہذیب سے بلند چیڑ کے اُونچے اُونچے پیڑوں کے صحت بخش سائے میں واقع ہے مجھے اُس محبت کی لاش نظر آ رہی ہے۔ جس کا منصف صاحب کے گھر میں انتقال ہو گیا تھا۔ منٹو کسی مجاور کی طرح اُس کے سرہانے بیٹھا ہے اور پہرا دے رہا ہے تاکہ کوئی کفن چور دیوانہ اِس معصوم لاش کی بے حرمتی نہ کرنے پائے۔ وہ پتھر، جسے وہ "میز کے طور پر استعمال کرتا تھا" اِس مقدس آستانے کی لوحِ مزار ہے۔ زائرین کو وہ بار بار اُس کتبہ کی عبارت کو سمجھنے کی ہدایت کرتا ہے، جو اُس نے اپنی نوکِ قلم سے اُس پر کندہ کی ہے:۔

"وہ غلط کار ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم تھی۔
میری سیدھی سادی باتوں نے اُس مایوسی کو (جو
ایک خط کے مصنف کے نرالے طرزِ عمل سے
پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس نے اس سے وہ چیز

طلب نہیں کی تھی جو اُس پہاڑی پڑاؤ کے دوسرے
مسافر طلب کرتے تھے) حیرت میں تبدیل کر دیا۔
آہستہ آہستہ یہ حیرت اس خواہش کی شکل اختیار
کر گئی کہ وہ اس نئی رسم و راہ کی گہرائیوں سے
واقفیت حاصل کر لے۔ یہ خواہش یقیناً ایک
مقدس معصومیت میں تبدیل ہو جاتی اور وہ اپنی
نسوانیت کا وقارِ رفتہ پھر سے حاصل کر لیتی،
جسے وہ غلط راستے پر چل کر کھو بیٹھی تھی۔ لیکن
افسوس مجھے اُس پہاڑی گاؤں سے دفعتہً اپنے
شہر واپس آنا پڑا۔

رخصت ہوتے وقت اُس کی سدا متبسم آنکھوں
میں دو چھلکتے ہوئے آنسو بتا رہے تھے کہ حقیقی
محبت کی ایک ننھی سی شعاع اُس کے سینے کی
تاریکی میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ ہے میری داستان
جس میں بقول تمہارے، لوگ اپنی دلچسپی کا
سامان تلاش کرتے ہیں۔ تم نہیں سمجھتے کہ میں یہ
داستانیں کیوں لکھتا ہوں۔ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔"

دہشت پسند بھگت سنگھ کی دلآویز مسکراہٹ اور منصف صاحب کی غیض آلود نگاہوں میں پرورش پانے والے نوجوان کو یہ جانتے دیر نہ لگی کہ اُس کی نجات چاہے جانے میں نہیں بلکہ چاہنے میں ہے۔ اگر اُس سے محبت نہیں کی گئی تو کیا ہوا۔ اُسے محبت کرنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ اُس کی "برادری" نے اُسے ملعون و مردود قرار دیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اگر محبت کا معجزہ مجھ میں ظہور پذیر ہو سکتا ہے تو اُن مردودوں اور ملعونوں میں کیوں رونما نہیں ہو سکتا جن کا حقہ پانی "سماج" نے بند کر رکھا ہے۔ گورکی اور دوستوئیسکی کی طرح وہ اِس راندۂ درگاہ مخلوق کے "سیاہ سینے" میں محبت اور انسانیت کی ننھی سی شعاع تلاش کرنے کے لئے زندگی کے 'جہنم زار' میں اتر جاتا ہے۔ جہاں معاشرے کے مظالم سے کراہتی ہوئی مُڑی تُڑی روحیں آدم و حوا کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔ اپنی پاکی و طہارت پر نازاں 'معاشرہ' ان دوزخیوں کی آلودگی کے تصوّر سے کانپ کانپ اُٹھتا ہے اور اس "زندہ رود" کو جو اُنھیں یہ خوفناک منظر دکھا رہا ہے، گالیاں دیتا ہے لیکن منٹو انھیں کہتا ہے 'یہ تمھارے ہی حمام کی آلائش ہے' 'یہ جہنم خود تمھاری ہی تخلیق ہے'! مگر وہ اِسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ 'ٹھہرو!' وہ کہتا ہے۔ 'ان سے گھن کھانے والو۔ ان کی ظاہری کراہت پر نہ جاؤ۔ اُس گندگی کے باوجود، جو تم نے ان کے چہروں پر تھوپ رکھی ہے۔ ان میں اب بھی مسجودِ ملائک کی روح پوشیدہ ہے۔

میں انھیں اپنے آنسوؤں سے وضو کراؤں گا۔ تمھاری بھینگی آنکھیں جنھیں کجی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اُن کے حسن کی تاب نہیں لاسکیں گی۔" اُس نے کہا تھا:

"تم نہیں سمجھتے اور نہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں
یہ داستانیں کیوں لکھتا ہوں۔ پھر کبھی سمجھاؤں گا۔"

وہ زندگی بھر یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اگر اس کی باتیں کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکیں تو اُس کا نہیں اُن کی سمجھ کا قصور ہے۔ اُس نے مہاتما بدھ کی طرح "ویشیا" کو سینے سے لگالیا اور مسیح کی مانند سماج کے کوڑھیوں کے ناسور صاف کیئے اور بتایا کہ اِن پھوڑوں کی جڑیں کہاں ہیں۔ اُس کی داستانیں ——— لیکن اُس کی اپنی کہانی ادھوری رہی جارہی ہے۔

"دارالاحمر" میں پھر بڑا ہنگامہ ہے۔ ہم پھر فیل ہو گئے ہیں۔ اب؟ اُدھر رسائل کے خاص نمبروں کی جدّت ختم ہو چکی ہے۔ اور یوں بھی ترجمہ آخر ترجمہ ہے، پرائے خیالات! ——— تو؟ تعلیم مکمل کی جائے!۔ مگر وہ لڑکے جو ہم سے برسوں پیچھے تھے، آگے نکل چکے ہیں۔ اُستاد کیا کہیں گے۔ امرتسر کے کالجوں کے دروازے بند ہیں! اصلاح ٹھیرتی ہے کہ علیگڈھ چلیں اور طعن آلود نظروں سے دور خود کو یونیورسٹی کے حجروں میں بند کر کے چپ چاپ تعلیم کا چلّا کھینچیں اور اُسی وقت باہر نکلیں۔ جب ہمارے کندھوں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے گاؤن ہوں۔ علیگڈھ کے حجروں سے تربیت پاکر کیسے کیسے نامی لوگ نکلے تھے۔ اِن میں جب امرتسر

کے دو آوارہ نوجوانوں کا نام شامل ہوگا تو اُن کے ہم عصر دیکھتے رہ جائیں گے

ہمارے پیر و مرشد باری صاحب بھی تو وہیں کے تربیت یافتہ تھے۔ انھوں نے
وہاں سے کوئی ڈگری تو نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن اِس تعلّق پر انھیں بہت ناز تھا او
وہ اپنے نام کے ساتھ "علیگ" اِس اہتمام سے لکھتے تھے جس طرح سرکار انگریز
کے خطاب یافتہ اپنے نام سے پہلے رائے بہادر اور خان بہادر کی دُم لگا
تھے — "علیگڈھ" کا نام علم و عظمت کا نشان تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ضیا الدین احمد (ج
اُن دنوں علیگڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) اور کچھ اور با اثر لوگوں کے نا
تعارفی اور سفارشی خطوط لئے گئے اور عزّت، عظمت اور علم کے بھوکے دو
نوجوانوں، سعادت حسن منٹو اور ابو سعید قریشی نے امرتسر کو اس نیت سے سلا
کیا کہ اب تو زندہ باد کے نعروں میں ہی ملاقات ہوگی۔ گاڑی جب امرتسر ک
پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی تو ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اپنی پرانی کینچلی
اُتار رہے ہیں۔

گاڑی جب علیگڈھ کے پلیٹ فارم کے پہلو میں رکنے لگی تو ہمارے دل
دھک دھک کر رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ "نا معلوم" کا خوف ہمارے چہرو
پرچھالوں کی طرح تیر رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر شیروانی پوش نوجوانوں کی ٹولیا
نظر آرہی تھیں۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا، یونیورسٹی کے "سین
اور استقبالیہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ جو نئے طلبا یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے۔

آتے، یہ سینیئر انھیں سیدھے سٹیشن سے اپنے ہاسٹل میں لے جاتے تاکہ انھیں
اِدھر اُدھر بھٹکنا نہ پڑے۔ ہمارے کمپارٹمنٹ کے سامنے بھی ایک ایسی ہی
ٹولی موجود تھی۔ اُن کی شیروانیوں کے کالروں اور بٹنوں پر یونیورسٹی کے نشان
چمک رہے تھے۔ اِس ٹولی میں سے ایک شخص جو اُن سب سے ہر لحاظ میں
'سینیئر' معلوم ہوتا تھا ہماری طرف بڑھا۔ ہم نے اُس کی "السّلام علیکم" کا
جواب "السّلام علیکم" سے دیا۔ علیگڈھ کی روایات کے مطابق، جن سے ہمیں
پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا، "جونیئر" کا فرض تھا کہ اپنے سینیئر کو پہلے سلام کرے۔
سینیئر اگر پہل بھی کرے تو بھی اُسے اِس روایت کو ملحوظِ خاطر رکھنا تھا۔ اِن
"آداب" سے آشنائی ہمارے آڑے آئی۔ ہم نے آتے ہی تسلیم کر لیا تھا کہ
وہ ہم سے سینیئر ہیں۔ چنانچہ اُن کے تعصب کی ایک دیوار ہمارے پلیٹ فارم
پر قدم رکھتے ہی ڈھے گئی اور اُن کے چہروں پر اپنے "بڑے پن" کا جو کھنچاؤ
نظر آرہا تھا اور انداز میں FIRST YEAR FOOL کے لیے جو مخاصمت
پوشیدہ تھی، رخصت ہو گئی۔ اُن کا لیڈر بڑی بڑی خوفناک مونچھوں اور کسرتی
جسم والا ایک نوجوان تھا۔ "آپ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیئے آئے
ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ "جی ہاں!" ہم نے جواب دیا۔ اُس کے ساتھیوں
نے کہا۔ "خوب! خوب! خوب!" جیسے کہہ رہے ہوں کہ آپ کی صورت
تو دیکھا چاہیے، لیکن مونچھوں والے نے اُن پر ایک تحکّمانہ نگاہ ڈالی کہ

نہیں !۔ اس مختصر سی ساعت میں سعادت نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کونے اُوپر کو اُٹھ رہے تھے جیسے اُس کے بھی بڑی بڑی مونچھیں اُگ آئی ہوں۔ "آپ کا نام ؟" مونچھوں والے نے سعادت سے پوچھا۔ جواب ملا۔ "سعادت حسن منٹو"۔ سوال ہوُا "جی ؟" شاید وہ منٹو کے نام کو نہیں سمجھے تھے۔ سعادت نے بلند آواز میں کہا۔ "سعادت حسن منٹو !" پوچھا گیا۔ "لارڈ منٹو سے کوئی عزیزداری ؟" سعادت نے کہا۔ "وہ میرے دادا ہوتے تھے"۔ پلیٹ فارم قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ مونچھوں والے نے سعادت سے زور کا مصافحہ کرتے ہوئے کہا : "او وٹے"۔ ("وٹا" پنجابی میں پتھر یا اینٹ کو کہتے ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوُا کہ سردار خاں یہ لفظ خلوص و محبت کے جذبات کے اظہار کے لئے استعمال کرتا تھا) منٹو نے کہا بالکل وٹا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "آپ کی تعریف ؟" — "ابو سعید قریشی"۔ "اور آپ کا صاحبزادہ کہاں ہے۔ سعید جس کے آپ باپ ہیں"۔ میں نے کہا کالج میں پڑھتا ہے۔ سردار خاں چیخ اُٹھا۔ "او وٹا۔ دوسرا وٹا !" اور ہم اِکّوں میں لد کے یونیورسٹی روانہ ہوئے۔

سردار خاں، ایس۔ ایس ہال کا ایک برگزیدہ سینیئر تھا۔ وہ متعدد بار فیل ہو چکا تھا اور ابھی آئندہ بھی فیل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دراصل اُسے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی فضا سے پیار تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جو دم وہاں

گذر جائے غنیمت ہے۔ وہ بلوچ سردار کا لڑکا تھا۔ گھر سے دو تین سو روپے ہر مہینے آجاتے اور ڈنڑ پیلتا، ڈمبل گھماتا، کھاتا، مونچھوں پر تاؤ دیتا اور قہقہے لگاتا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں ہمارا دوست بن گیا اور ہمیں دوسرے سینئروں کا کھٹکا نہ رہا۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ ہم بھی پنجاب یونیورسٹی کے سینئر ہیں اور اگر ہم فیل نہ ہوتے تو اب تک ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کر چکے ہوتے تو ہمیں اپنا ہم پیشہ تصوّر کرنے لگے اور ہم سے گھل مل گئے۔ اور بے شمار جونیئر ہمیں رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان میں شاہد لطیف (عصمت چغتائی کا شوہر) بھی تھا۔ جو بعد میں ہمارا دوست بن گیا۔ شروع شروع میں ہم اُسے شرارتاً "چیکو" کہا کرتے تھے۔ بعد میں یہ اُس کا دوسرا نام بن گیا۔ پہلے پہل وہ اس نام سے چڑتا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ اس میں ڈنک نہیں ہے تو مانوس ہو گیا۔ اس پر بھی کبھی کبھی وہ گالیاں بکنے لگ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سعادت اُسے نہایت سنجیدگی سے کہتا۔ "جناب شاہد لطیف صاحب" مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ بناوٹ ہے۔ وہ بھڑک اُٹھتا۔ لیکن دوبارہ چیکو کہنے سے وہ پھر ہمارا بے تکلف دوست بن جاتا۔ جو یوں تو آفتاب ہال کا باشندہ تھا لیکن جس کا بیشتر وقت ہمارے یہاں ۱۴۔ ایس۔ ایس ایسٹ میں کٹتا تھا۔ اگر ہمارے سینئروں نے ہمیں دھوکا نہیں دیا تو مولانا محمد علی جوہر بھی اسی کمرے میں رہا کرتے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو ۱۴۔ ایس۔ ایس ایسٹ دوہری تاریخی اہمیت کا مالک ہے۔

اس میں ہم نے پھولوں والی جالی کے پردے لٹکائے۔ فرش پہ دری تھی۔
سامنے دیوار کے ساتھ ساگوان کے شیلف میں "دنیا کے بہترین افسانے" کی
دس جلدیں چمک رہی تھیں۔ اس کے اوپر وکٹر ہیوگو کی ایک آئیل پنٹینگ تھی۔
جسے میں آتی دفعہ یونیورسٹی کی نذر کر آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے بھی سرار خاں
کی طرح علیگڈھ سے پیار ہوگیا تھا۔ نہیں۔ اس میں بھی وہی عظمت و شہرت کی خواہش
کارفرما تھی جس نے دنیا بھر کے دہشت پسندوں اور انقلابیوں کو ہمارا ہیرو
بنا دیا تھا۔ مجھے کسی زمانے میں واٹر کلر پینٹنگ کا بہت شوق تھا۔ لیکن بورڈ پر
کاغذ چپکانا بھی نہ آیا۔ چنانچہ میں نے جب بھی مُوقلم اٹھایا، کاغذ کی شکنیں دیکھ کر
میرے شوق نے ہر بار ہمت ہار دی۔ وکٹر ہیوگو کی یہ تصویر میں نے آفو پینٹر
سے بنوائی تھی۔ اُس کا ذریعہ معاش تو سائین بورڈ پینٹنگ تھا۔ لیکن اُس میں ایک
اچھا مصوّر بننے کی سبھی صلاحیتیں موجود تھیں۔ ٹیکنیک اور ذوقِ سلیم! موسیقی کا
وہ دلدادہ تھا۔ مَنٹو پہلی بار اُسی کے یہاں اُستاد عاشق علی خاں سے متعارف
ہوا تھا۔ اور اس کی رپورٹ پیش کرتے وقت کہا تھا "کوئی آواز ہے خدا کی قسم

گزوں سے ناپ لو!"

ہے بنجارا، بھلا بنجارا
ساڈے ہان دانی
اوہ یار کنوارا

ہم دیر تک اُستاد عاشق علیخان کی زبان سے سنتے ہوئے اس لوک گیت کا مزا لیتے رہے تھے۔ پنجاب کی دیہاتی بولیاں لکھتے وقت سعادت کے ذہن میں یہی گیت گونج رہا تھا جو اُس نے انور پینٹر کی دوکان پر سنا تھا۔ انور کی جمالیاتی حس خواب بیدار تھی اگر اُسے تربیت کا پورا پورا موقع ملتا اُس کی حوصلہ افزائی ہوتی اور اُسے اپنا پیٹ پالنے کیلئے دوکانوں کے ماتھوں پر لٹکانے کے لئے بورڈ نہ پینٹ کرنے پڑتے تو اُس کی تصویریں آرٹ گیلریز میں آویزاں ہوتیں۔ وکٹر ہیوگو کی تصویر انور نے بڑی محنت سے بنائی تھی لیکن امرتسر سے علیگڈھ آتے وقت ہم نے ایک فراڈ کیا۔ انور سے کہا اس پر سے اپنا نام مٹا کر اُس کی جگہ سعید لکھ دو ـــــ یہ فراڈ شاید اب بھی علیگڈھ یونیورسٹی کی کسی دیوار پر آویزاں ہوگا۔ کبھی یہ تصویر ۱۴۔ ایس۔ ایس کی دیوار پر آویزاں تھی۔ لیکن کمرے کو آراستہ کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود اُس کی اُداسی دور نہ ہوتی۔ بلکہ اس میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ کمروں کے دروازوں کا ذکر کرتے وقت عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں دروازہ فلاں طرف "کھلتا" ہے لیکن ہمارے کمرے کا بھی دروازہ ایک اداس سڑک پر "بند ہوتا تھا" اس کی موٹی موٹی سلاخیں باری صاحب کی ڈائری کے پہلے صفحے پر "دریچۂ زنداں" کی یاد دلاتی تھیں۔ لیکن جلد کی مخمل غائب تھی۔ اور پس منظر میں کسی کے عارضِ گلگوں کی یاد دلانے والے کاغذ کے بجائے سلیٹی سڑک کا ٹکڑا پھیلا ہوا تھا اور

کوشش کے باوجود ہم دس بیس گز اِدھر اور دس بیس گز اُدھر سے زیادہ دور نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے کے دروازے کے سامنے "پکی بارک" کا چوکور سا صحن تھا۔ یہیں بیت الخلا تھے جنھیں سبز باڑھ کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ جب دیکھئے لوگ باگ لوٹے لئے آرہے ہیں۔ صبح کے وقت یہاں لڑکوں کا ہجوم ہوتا جو ہاتھوں میں بھانت بھانت کے لوٹے لئے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے۔ آج جب میں اس منظر کا تصوّر کرتا ہوں تو فضا میں صرف لوٹے ہی لوٹے نظر آتے ہیں۔ شکلیں سب غائب ہیں ــــ "اجتماعیت" کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ منٹو کو اس کے بعد بھی اس سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کے افسانے "سراج" میں کھولی کی فضا خالی خولی افسانہ نگاری نہیں اُس کے تجربہ خانے، جہاں وہ اپنے افسانوں میں بار بار قارئین کو لے جاتا ہے، اسی قسم کے سنڈاس اور موتریاں ہیں۔ جن کی سڑاندھ معاشرے کے اپنے جسم، اپنی غلاظت کی آئینہ دار ہے۔ اُس کے ناک چڑھے نقادوں کے عطر لگے رومال اِس بدبو کو نہیں دبا سکتے ــــ یہ تعفن خود اُن کے اپنے پھیپھڑوں، اپنے سانسوں کا تعفن ہے۔ لیکن وہ اِس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اُن کے سر اُن لوٹوں کی طرح ہیں جن میں وہ پاکی و طہارت کا پانی لئے پھرتے ہیں ــــ علیگڑھ کی دانش گاہ میں بھی ایسے کئی چہ بچے اور حوضیاں ہیں، جن کے کنارے، سر سیدؒ کی روح کو فاتحہ کا ثواب پہنچانے والے وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے

ہیں۔ یہاں دانش گاہ کی مقدّس خانقاہ میں، امرد پرستی کا پیڑ روایات کی فضا میں پرورش پا رہا ہے۔ خانقاہ کے راہبوں کو اپنی روایات پر ناز ہے۔ انہی میں وہ ACTIVITIES بھی شامل ہیں، بزرگوں نے جن کے درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ "تعزیراتِ علیگڈھ" کی دفعہ ۱ کے مطابق، رات کو سوتے میں کسی پر غلاظت کا ڈھیر پھینک دیا جاتا ہے۔ دفعہ ۲ کے رُو سے گندے پانی کا گھڑا پھوڑا جاتا ہے ...... یہاں طالبات کو زنانہ کالج کے قلعے میں بند کر کے لڑکوں کی زندگی میں شائستگی پیدا کرنے کی تمام راہیں بند کر دی گئی تھیں۔ باہر جاؤ تو تمھارے سر پہ پھندنا ناچ رہا ہو۔ سینما جاؤ تو پرمٹ لے کر ورنہ پروکٹر چالان کر دے گا۔ غرض زندگی اُن علاقوں کی طرح جو فوجیوں پر ممنوع قرار پاتے ہیں بالکل حد باہر ہو کر رہ گئی تھی۔ یار لوگ ریلوے سٹیشن سے گزرنے والی گاڑیوں سے حرارت حاصل کرنے جاتے اور اپنی اداسی میں اور بھی اضافہ کر کے چلے آتے جن کے پاس پیسے ہوتے وہ گاہے ماہے دلّی یا آگرے کا رُخ کرتے اور دو چار دن زندگی سے خوب انتقام لے کر لوٹ آتے۔ لیکن پہلے سے بھی زیادہ مضمحل ...... اس ساری فضا سے ہمارا دم گھٹنے لگا۔ منٹو کی صحت پھر بگڑنے لگی۔ پھر وہی سینے کا درد۔ جب ساون کی پہلی بارش پہ علیگڈھ والوں نے اپنی روایات کے مطابق کیچڑ کا میلہ MUD RIOT منایا۔ تو سعادت کے سینے میں بہت درد تھا۔ ہم نے اُسے اس طوفانِ بدتمیزی سے

بچانے کے لئے بہ مشکل تمام کمرے میں بند کیا اور باہر تالا ڈال دیا۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہو رہا تھا اور ہمیں ڈر تھا کہ وہ خواہ مخواہ فسادیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گا۔ لیکن ہماری ٹولی کیچڑ اچھالنے والوں کو جیسے تیسے اپنے علاقے سے دور لے گئی۔ سردار خاں نے نعرہ لگایا کہ ڈیوٹی ہوسٹل پر حملہ بولا جائے گا۔ یہ ہندو طلبا کی اقامت گاہ تھی۔ ڈیوٹی ہوسٹل کا نام سن کر بلوائیوں کی ٹولی کا رخ دوسری طرف ہو گیا۔ ہر طرف ڈیوٹی ہوسٹل! ڈیوٹی ہوسٹل! کے نعرے لگ رہے تھے۔ ڈیوٹی ہوسٹل اچھا خاصا BASTILE بن گیا۔ اور یکی بارک کی بلا ٹل گئی۔

سعادت کی صحت آئے دن بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے ڈاکٹروں نے کہا ایکس رے کرنا ہو گا۔ اس کے لئے اسے دلی جانا پڑا۔ ایکس رے میں انھیں پھیپھڑوں پر دھبے دکھائی دیئے۔ یونیورسٹی کے ڈاکٹروں نے کہا دق ہے۔ سعادت کو یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ اس کے جانے کے بعد شہاب میرے کمرے میں چلا آیا۔ خوب آدمی تھا۔ بوقتِ ضرورت میں اس سے قرض بھی لے لیا کرتا۔ جس کی واپسی کا اس نے کبھی تقاضا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے مجبوراً روپے واپس کرنا ہوتے۔ وہ دکن کا رہنے والا تھا۔ اس کی اچکن کے تین انچ چوڑے کالر اور اس کی جمع (تی) پر ہر روز فقرے چست ہوتے چپکو سے اس کی گالی گلوچ کی حد تک بے تکلفی تھی۔ کہا کرتا "سالے کو گالیوں

سے عرفان ہوتا ہے"۔جواب ملتا: "واہ بے سالے میر درد کے لونڈے ـــ"
فیصلہ اسی پر ہوتا کہ دونوں پہنچے ہوئے ہیں۔ شہاب "چار مینار" مارکہ سگرٹ
پیتا تھا۔ کہا کرتا "حضور نظام" خود بھی پیتے ہیں"۔ چیکو گالی دے کر کہتا۔"اس سے
بڑھیا پیئے تو ہارٹ نہ فیل ہو جائے"۔ شہاب گولکنڈہ کے تہ خانوں میں نظام کے
خزانے کی کہانیاں سناتے سناتے اچھا خاصا الہ دین بن جاتا۔"سونے سے لدے
ہوئے ٹرک دفن ہیں.... زمرد کے ٹی سیٹ!" مگر چیکو ناک میں ہوتا "سالے
تیرے باپ نے بھی زمرد دیکھا ہے ؟" اور پھر 'عرفان و آگہی' کا سلسلہ شروع
ہو جاتا..... ہمارے دو ساتھی اور بھی تھے۔ کفایت قادری۔ یہ بھی دکنی تھا
اور عبداللطیف۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اُس پر ہمیشہ پھبتی رہتی۔" سالے تجھ
سے بھی کبھی وفا کی اُمید ہو سکتی ہے۔ بلّی کے بچّے۔ فرنگی کی اولاد!"

یہ چہچہے سعادت کے چلے جانے کے بعد خاموش سے ہو گئے۔ چیکو
اور شہاب اب بھی 'عرفانیات' میں طبع آزمائی کرتے لیکن مجبوری نماز کی سی
کیفیت ہوتی۔ میں اور شہاب اپنے دریچۂ زنداں کی آہنی سلاخوں کو تھامے
خلاؤں میں دیکھا کرتے۔ وہ بمبئی اور حیدر آباد کے نظاروں میں ڈوب جاتا۔
اور میں امرتسر اور لاہور کے جلووں میں کھو جاتا۔ ایسے میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا
کہ سڑک سے گذرتی ہوئی کسی کار میں کسی کا رنگین آنچل خیال کی طرح ہمارے
آنسو پونچھتا ہوا لہرا جاتا اور ہم دنوں سوچتے رہتے کہ وہ کون تھی ؟ ـــ لیکن

رنگ کے اس جھونکے کے باوجود زندگی کس قدر بے رنگ تھی۔ میری طبیعت
جو پہلے ہی اُچاٹ ہو چکی تھی اور اُچاٹ ہوگئی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں لطیفن اور
شہاب اور چند اور دوست مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئے۔

گاڑی جب علیگڑھ کا پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی تو مجھے یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے ڈاکٹریٹ کا وہ چغہ جسے حاصل کرنے کے لئے ہم آٹھ نو ماہ پہلے
امرتسر سے چلے تھے۔ میرے کندھوں سے پھسل کر کہیں انجن کے دھوئیں میں اُڑ
گیا ہے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ ماہ میں ہمارے ایک اور منصوبے کا اسقاط ہو گیا۔
ہم "علیگ" کا خطاب حاصل نہ کر سکے۔ لیکن اس سانحہ، کو ہم نے کبھی اپنی حسرتوں
کی فہرست میں شامل نہ کیا۔ ہمارا علیگڑھ کا قیام ایک ایسا سپاٹ اور بے کیف
دور تھا کہ پھر کبھی ہماری گفتگو کا موضوع تک نہ بن سکا۔

علیگڑھ سے میں نے سیدھا لاہور کا رُخ کیا۔ تعلیم بہرحال مکمل ہونا چاہئے
اور وہاں ایک کالج میں شریک ہو گیا۔ سعادت بھی لاہور چلا آیا۔ مگر تعلیم
خاطر نہیں، تلاشِ روزگار میں۔ اُس کی صحت خراب تھی۔ ڈاکٹر دق کی تصدیق
کرتے چلے آ رہے تھے۔ صرف ایک ڈاکٹر کو اس سے اختلاف تھا اور بعد
میں اُس کی تشخیص درست نکلی۔ بہرحال دوائیوں کے لئے پیسہ درکار تھا
ایسے میں تعلیم کا خرچ اُٹھانا مشکل تھا۔ گذر اوقات کے لئے سعادت نے
کرم چند کے اخبار "پارس" میں چالیس روپے ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ وہ اُن

دنوں موہنی ہوسٹل میں رہتا۔ کمرے کا کرایہ شاید پانچ روپے تھا۔ اور ہوسٹل ایسے
علاقہ میں واقع تھا جہاں ابھی بدروئیں وغیرہ نہیں بنی تھیں۔ ادھر اُدھر کھیتوں میں
وڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے اور پانی اکٹھا رہتا۔ چنانچہ ہوا کے ہر
جھونکے کے ساتھ مچھروں کے چھینٹے آتے اور کانوں میں ہوائی جہاز گونجتے۔
ہیں مکھیاں؟ سو کمرے کی ہر چیز سیاہ نظر آتی۔ میں اُن دنوں پہلے تو ہوسٹل
ں تھا لیکن بیمار ہوا تو بڑے بھائی کے یہاں راوی روڈ پہ اُٹھ آیا۔ اب
ری ملاقات عرب ہوٹل میں ہوا کرتی۔ باری صاحب اُن دنوں احسان،
ہباز یا شاید آزاد میں کام کرتے تھے۔ اُن کی فاقہ مستی کا وہی حال تھا تنخواہ
ید ہی کبھی وقت پر ملی ہو۔ چنانچہ عرب ہوٹل سے اکثر لمبا چوڑا حساب رہتا
۔ کبھی کبھی وہ دفتر سے انتقاماً پرانے اخباروں کا بنڈل اُٹھا لاتے اور ردی
کر چائے پی جاتے ___ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ اشتراکی ادیب باری
ت بڑا رومانٹک تھا۔ باری صاحب کا انتقام بھی اسی رومان پسندی کا
دار تھا ___ لیکن لاہور میں "دار الاحمر" کی فضا قائم نہ ہو سکی۔ دراصل اپنے
احباب کے بارے میں ہم سخت حاسد تھے۔ بالکل سکول
لڑکوں کی طرح۔ اگر کوئی پانچواں شخص ہماری دوستی کا دم بھرتا
ا تو ہم 'کباب' ہو جاتے۔ لیکن ہوٹل میں تو ایک آتا تھا اور ایک جاتا
کثر اجنبی بھی کرسی گھسیٹ کر ہماری میز پہ چلے آتے۔ عرب ہوٹل اُن

دنوں صحافیوں کا اڈّہ تھا اور سبھی باری صاحب کو جانتے تھے۔ چنانچہ علیک سلیک اور حال احوال دریافت کرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس پر چار کباب اور دو روٹی! ایک بُھنا ہوا اور تین چائے کی پکار سخت کبابیت، کا عالم تھا۔ یوں لگتا تھا کہ "دارالاحمر" ہمیشہ کے لئے مقفل ہو گیا ہے۔ وہ کام جو پولیس نہ کر سکی زمانہ کر رہا تھا۔

اُدھر سعادت کو "پارس" کی اصلیت معلوم ہو رہی تھی۔ "پارس" کا مالک بہت کھوٹا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ معاملہ کا گندا۔ اور اُس سے بھی گندی اس کے اخبار کی پالیسی تھی جس کا مقصد اپنے معاصرین پر کیچڑ اچھالنا تھا بات اگر حریفانہ چشمک تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن منٹو اپنے اخبار کے مالک کی ذہنی پستی تک نہیں اُتر سکتا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اُس کیچڑ سے آلودہ کرنے سے انکار کر دیا جس کے عوض اُسے چالیس روپے ماہانہ کا نوکر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ یہ تعلق بہت جلد ختم ہو گیا۔ سعادت اِن دنوں سگار پی رہا تھا۔ جس کا اس کی صحت پر اور بھی بُرا اثر پڑا۔ سینہ میں درد تو رہتا ہی تھا۔ اب کھانسی بھی آنے لگی اور خود اُسے بھی گمان گذرنے لگا کہ ڈاکٹر کہیں سچ ہی تو نہیں کہہ رہے تھے۔

باری صاحب نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ "لاہور کی رصد گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرو۔" لیکن اُس کا ستارہ بمبئی کے بُرج میں طلوع

ہو رہا تھا ــــ بمبئی جہاں فلمی دنیا کو "منشیوں کی ضرورت تھی اور ہفتہ وار "مصور" کو ایڈیٹر درکار تھا ــــ بمبئی، جس کے نگار خانوں میں ہمارے اوائلِ شباب کی کئی حسرتیں زندگی کے سانس لے رہی تھیں۔ فلمی آسمانوں کے ان گنت ستارے زمین پر اُتر آئے تھے۔ بمبئی جہاں پیسہ تھا جو ایک مفلس مصنف کی جسمانی بقا اور اُس کے انسانی وقار کے لئے بہت تھا ــــ بمبئی جہاں آدمی ہجوم میں رہ کر بھی اپنی انفرادیت نہیں کھوتا۔ بمبئی جس کے گلی کوچوں میں منٹو کے افسانوں کے جیتے جاگتے کردار بستے ہیں اور اُسی کی طرح محبّت اور وقارِ انسانی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ بمبئی جہاں منصف صاحب کی نگاہیں اُس کا تعاقب نہیں کر سکتیں۔

"تماشا ہُوا ہُوا!"

"سعید صاحب! ——"

میں نے کھڑکی سے جھانک کر گلی میں دیکھا۔ تار والا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن تار پڑھا تو چہرہ چمک اُٹھا۔ سیڑھیوں میں میری بیوی انتظار کر رہی تھی۔

"خیریت؟"

"سعادت آرہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اور آپا صفیہ؟"

"اُن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ لکھا ہے۔ ہیرد کو فرنٹیئر میل سے آرہا ہوں۔ لاہور پہنچ جاؤ۔"

یہ ۱۲ ر دسمبر ۴۲ء کی بات ہے۔ میں امرت سر میں تھا۔ اُس شام آل انڈیا ریڈیو لاہور سے مجھے THOMAS MANN کے بارے میں تقریر کرنی تھی۔ اگر سعادت کا تار نہ آیا ہوتا تو اُسی رات لوٹ آتا لیکن اب؟ —
وقت تھم گیا!

ہاں وہی تھا! فرسٹ کلاس ایئرکنڈیشنڈ کوپے کے دروازے میں کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر چلا رہا تھا۔

"خواجہ ابو سعید صاحب! خواجہ حسن عباس بی۔ اے!"

عباس اُن دنوں بی۔ اے کی مہم سر کر چکا تھا۔ سعادت اُسے چھیڑ رہا تھا۔ ہم دونوں اُس کے ڈبے کی طرف لپکے۔ گاڑی رُکی تو وہ ہمارے بازوؤں میں تھا۔

بستر اور سوٹ کیس قلی نے اُٹھایا۔ اٹیچی کیس میرے سپرد ہُوا۔

"احتیاط سے خواجہ!" اُس نے مجھے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا۔ اُس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ سلسلہ کولابہ ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

"لیکن باری صاحب کہاں۔ اُنھیں اطلاع نہیں ملی؟" اُس نے عبّاس سے پوچھا۔

"بڑے ذلیل الدھر ہیں باری صاحب کہہ رہے تھے سیدھا سٹیشن پہنچوں گا۔ رات کی ڈیوٹی پر تھے۔"

"بس سمجھ گیا" سعادت نے کہا۔ "کتنے ہوں گے پینا پڑے گی — بھاگ گئے۔ ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ بس۔ ہیگل سے کارل مارکس تک کا چکر ابھی ختم ہوا جائے گا۔ مل لیں خدا کی قسم پھر دیکھو آج کیا ہوتا ہے۔ ہیں تو یہیں کہیں لائل پور کی رصد گاہوں میں تو نہیں چلے گئے اپنے ستاروں کا جائزہ لینے۔ میں نے تار پہ تار دیئے۔ ٹکٹ بھیجے۔ پیسے روانہ کئے کہ بمبئی چلے آؤ اور لعنت بھیجو لاہور پر لیکن جواب ہی کوئی نہیں — کیا ہو گیا اُنھیں۔ تو بھی تو انھیں کچھ نہیں سمجھا سکا عباس؟ بس جی آج ہو کے رہے گا فیصلہ۔ یہ کیا فراڈ ہے آخر؟"

تانگہ رُکا۔ باری صاحب اور عباس نے اُن دنوں نگینہ بیکری کی بغل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ اُس کے نیچے شاید آج کل سولا ہیٹ بنتے ہیں۔ کمرہ مختصر سا تھا۔ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ باری صاحب کے لکھنے کی میز تھی جہاں تاریخ و معاشیات کی کتابیں اور کاپیاں وغیرہ بڑی صفائی سے رکھی ہوئی تھیں۔ اسی دیوار پہ ہمارا ایک گروپ فوٹو فریم میں آویزاں تھا۔ باری صاحب کو تصویروں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن یہ گروپ وہ جہاں بھی گئے اُن کے لکھنے کی میز کے سامنے آویزاں رہا۔ اس میں عباس کھڑا ہے۔ باری صاحب سعادت اور میں بیٹھے ہیں اور ہمارے سامنے میز پہ موٹی موٹی کتابیں پڑی ہیں۔ جیسے کوئی کانفرنس ٹیبل ہو اور دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ شاید کوئی بہت ہی اہم کام ہو رہا تھا جس پہ آزادی، انقلاب یا اسی قسم کی کسی چیز کا دارومدار تھا۔

لیکن غور سے دیکھا جائے تو جو کتاب میرے سامنے پڑی ہے اس پر NANA کے حروف نظر آتے ہیں۔ زولا کا یہ ناول اُن دنوں پہلی بار ANTIQUE PAPER پر چھپ کر لاہور کے کتب فروشوں کے ہاں آیا تھا۔ اس میں بہت تصویریں تھیں۔ چنانچہ سعادت نے اسے خرید لیا۔ منٹو کو کسبی سے جو ہمدردی ہے اُس کی نشوونما میں موپاساں، کوپرن اور زولا کا بھی ہاتھ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اُس نے اپنے کردار روس یا فرانس سے مستعار لیئے ہیں۔ کسبی چاہے کسی ملک کی ہو، اُس کا رنگ گورا ہو یا گندمی کالا ہو یا سانولا کسبی ہی رہے گی جو کبھی اپنا جسم بیچ کر پیٹ پالتی ہے اور کبھی محض اس لئے جسم بیچتی ہے کیونکہ یہ اُس کی آبائی دوکان ہے۔ یہ وہی دوکان ہے جس کے ہم آپ سبھی گاہک ہیں۔ ان میں بہت سی دکانیں ہم خود آئے دن کھولتے رہتے ہیں۔

لیکن بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ باری صاحب کے حجرے میں سامان رکھنے کے بعد کہیں سرسری سا ناشتہ کیا گیا۔ لیکن بھوک کہاں تھی۔ "دارالاحمر" کے درویش مدتوں بعد ملے تھے اور اپنے اپنے قصّے کہہ رہے تھے۔ سعادت نے معاشرے کی سوگند توڑ ڈالی تھی۔ اُس نے میرامّن کے چوتھے درویش کی طرح "ملک صادق" (جنوں کے بادشاہ) کی محبوبہ "گاتن" (بو کی ہیروئن) کے بدن پہ وہ تیل مل دیا تھا جس سے "ملک صادق" کو اپنی سفلی خواہشات

کی سڑاندھ سنگھائی دی تھی۔ یہ بدبو سارے میں پھیل گئی۔ چنانچہ شہرِ جنات اپنی اس برہنگی کو دیکھ کر سٹپٹا اُٹھا تھا اور اُس نے دیوؤں کو بھیج کر اُس گستاخ نوجوان کو جس نے اس کی شہوت کا راز افشا کیا تھا، بمبئی سے لاہور کھینچ بلایا تھا تاکہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ باقی تین درویشوں کو بھی اپنے اپنے قصے کہنے تھے۔ ہوٹل سے اُٹھ کر باری صاحب کے حجرے میں آ گئے۔

اٹیچی کیس کھلا۔ باری صاحب کا چہرہ زرد ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ بھاگ جاتے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتے، اُن کی کلائی سعادت کی گرفت میں تھی۔ ایسے موقعوں پر سعادت کی پتلی پتلی لانبی اُنگلیوں میں، جن سے وہ کاغذ پر نہایت صاف شفاف عبارت لکھا کرتا تھا، جس میں ایک لفظ بھی نہیں کاٹا جاتا تھا، بلا کی طاقت پیدا ہو جاتی تھی۔

"آج سب کھڑکیاں بند ہیں —— آج ہم "سیاہ

و سفید" کے مالک ہیں"

قہرِ درویش بر جانِ درویش

باری صاحب کی "خانقاہ" میں "تننا ہُو یا ہو!"

کا سا نعرۂ مستانہ بلند ہوا

بیار بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند

آشوبِ آگہی والوئے بیہوشی میں ڈوب گیا۔ دنیا و مافیہا کی حدیں سمٹنے لگیں قلندروں

اُنھوں نے کہا تھا جلد آجانا اور اتفاق دیکھیے جب میں باری صاحب کے حجرے کے سامنے پہنچا تو میرے ساتھیوں کا تانگہ بھی آگیا۔ باری صاحب قہقہے لگاتے ہوئے تانگے سے کود پڑے۔ میں نے پوچھا "کہیے؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ پریس گئے تھے اخبار چھپ رہے تھے۔ رسالے چھپ رہے۔ ماہنامے، ہفت روزے روزنامے" اور وہ ہاتھ کی انگلیوں پر اُن تمام اخباروں کے نام گن گئے جن میں اُن سے بدمعاملگی ہوئی تھی۔ پھر دفعتاً جانے کیا خیال آیا۔ اپنے کان چھوئے جیسے توبہ کر رہے ہوں اور بیچ سڑک سجدہ داغ دیا۔

باری صاحب نے جو بات بظاہر نشہ کی حالت میں کہی تھی ہماری صحافت پر ایک خوفناک طنز ہے۔ لیکن یہ لرزہ خیز موازنہ قہقہوں کے شور میں ڈوب گیا۔۔۔ اُن کا حجرہ پھر "تتنا ہُو یا ہُو" کے نعرۂ مستانہ سے گونج اُٹھا۔ عبداللہ ملک اور بیدی بھی آگئے۔ اِس دوران میں کون کون سے موضوع زیرِ بحث آئے؟ یہ مجھے یاد نہیں۔

یاد ہے تو اتنا کہ لوہے کی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ آگ بجھنے لگتی تو باری صاحب اُٹھتے اور برابر کے مکان سے، جو خالی پڑا تھا، جنگلے کی لکڑیاں توڑ لاتے اور انگیٹھی میں جھونک دیتے۔ آگ پر اپنے گلاس سے چند قطرے ٹپکاتے اور "زرتشت! زرتشت" پکارتے۔

کمرہ کی فضا سگرٹوں کے دھوئیں اور شراب کے بخارات سے بوجھل تھی۔ لیکن "تننا ہو یا ہو" کا وِرد جاری تھا۔

ہم سوئے تو دو بج رہے تھے۔ جاگے تو چھ بجے ہوں گے۔ لیکن نہ سروں میں گرانی تھی نہ آنکھوں میں رتجگا۔ اپنی دس سالہ دوستی کے دوران میں، میں نے پہلی بار شراب میں سعادت کا ساتھ دیا۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور آخری محفل تھی۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سعادت نے اپنا ایک مجموعہ، ایک خالی بوتل سے منسوب کیا ہے۔ اس محفل کی یاد کو میں اُن چھوٹی بڑی خالی بوتلوں سے منسوب کرتا ہوں جو تیرہ اور چودہ دسمبر ۱۹۴۲ء کو باری صاحب کے حجرے میں خالی ہوئیں۔ باری صاحب اور عباس نے اِن بوتلوں کو بیچ کر یقیناً چاء پی ہو گی۔ لیکن میں آج بھی اُن کی شراب کا سرور محسوس کر رہا ہوں۔

نے زمانے کے پیر تسمہ پا کا سرا اپنے کندھوں سے کچل دیا۔ زہد و تقویٰ کی عبائیں اتار پھینکیں۔ فکر و اندیشہ کے عمّامے پٹک دیئے۔ دوش تھا نہ فردا فقط ایک حال تھا۔ ایک حقیقت! جس کی پیشانی پر "تننا ہُو یا ہُو" کے حروف رقص کر رہے تھے اور درویشوں کے ہونٹوں پر صرف ایک صدا تھی:

ہل من مزید

حال و قال کی یہ محفل نماز مغرب کے قریب کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے برخاست ہوئی۔ اٹیچی کیس میں سعادت جو زادِ راہ لایا تھا ختم ہو چکا تھا۔ عباس اور باری صاحب بھی اس میں اضافہ کر چکے لیکن "ہل من مزید" کا نعرہ پھر بلند ہوا۔ اب میری باری تھی۔ ہم نے کمرشل بلڈنگ کا رُخ کیا۔

"اسپِ ابیض!" — باری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں WHITE HORSE کا ترجمہ کیا۔ لیکن اُن کا مطالبہ دوکاندار کی سمجھ میں نہ آیا۔

"DONT B VAGUE!" سعادت نے کہا۔

باری صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اُن کی توند لرزنے لگی۔ دوکاندار ہمارا منہ تکنے لگا۔ آخر وضاحت کی گئی۔ باری صاحب نے بوتل بغل میں دبائی اور ہم دوکان سے باہر نکلے۔ عباس کو شرارت سوجھی:

"باری صاحب اگر اس وقت مولٰینا (صلاح الدین احمد) مل گئے۔ اور پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا ہے؟"

"عرقِ گاؤ زبان ہے یہ اور کیا؟" باری صاحب کی توند پھر ہنسنے لگی۔

مولانا تو خیر نہ ملے۔ اس دوران میں البتہ عبداللہ ملک اور راجندر سنگھ بیدی کو اطلاع ہو چکی تھی کہ منٹو آیا ہے، وہ آ گئے۔ لیکن یہ شاید دس گیارہ بجے رات کی بات ہے۔ اِس سے پہلے ہم نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومے کوئی آٹھ بجے کے قریب طے پایا کہ ہیرا منڈی چلا جائے۔ میں نے کسی کام کا بہانہ کیا، شور ہُوا: "خواجہ ابوسعید بھاگ گیا۔" اُنھوں نے تانگہ لیا اور مجھ سے یہ کہہ کر چل دیئے کہ ہم ابھی آتے ہیں۔ اپنا کام کرکے فوراً واپس آؤ۔ اِس مہم میں مَیں اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ اِس کا حال سعادت کے الفاظ میں سنئے:

"دیر تک ہم اِس منڈی کی تنگ و تار گلیوں میں گھومتے رہے۔ اِس دوران میں باری صاحب نے کئی پٹھان ٹکھیائیوں سے پشتو میں بات چیت کی۔ ایک ایسی ہی ٹکھیائی سے مصروفِ گفتگو تھے کہ اُن کی جان پہچان کا ایک آدمی اُدھر سے گذرا۔ اُس نے پوچھا "مولانا یہ کیا ہو رہا ہے؟" باری صاحب نے پٹھان کسبی کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "اِس لڑکی سے سیاسیاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔"

اُنھوں نے کہا تھا جلد آجانا اور اتفاق دیکھیے جب میں باری صاحب کے حجرے کے سامنے پہنچا تو میرے ساتھیوں کا تانگہ بھی آ گیا۔ باری صاحب قہقہے لگاتے ہوئے تانگے سے کُود پڑے۔ میں نے پوچھا "کہیے؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ پریس گئے تھے اخبار چھپ رہے تھے۔ رسالے چھپ رہے۔ ماہنامے، ہفت روزے، روزنامے" اور وہ ہاتھ کی اُنگلیوں پر اُن تمام اخباروں کے نام گن گئے جن میں اُن سے بدمعاملگی ہوئی تھی۔ پھر دفعتاً جانے کیا خیال آیا۔ اپنے کان چھوتے جیسے توبہ کر رہے ہوں اور بیچ سڑک سجدہ داغ دیا۔

باری صاحب نے جو بات بظاہر نشہ کی حالت میں کہی تھی ہماری صحافت پر ایک خوفناک طنز ہے لیکن یہ لرزہ خیز موازنہ قہقہوں کے شور میں ڈوب گیا — اُن کا حجرہ پھر "تتنا ہو یا ہو" کے نعرہ مستانہ سے گونج اُٹھا۔ عبداللہ ملک اور بیدی بھی آ گئے۔ اِس دوران میں کون کون سے موضوع زیرِ بحث آئے؟ یہ مجھے یاد نہیں۔

یاد ہے تو اتنا کہ لوہے کی انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ آگ بجھنے لگتی تو باری صاحب اُٹھتے اور برابر کے مکان سے، جو خالی پڑا تھا جنگلے کی لکڑیاں توڑ لاتے اور انگیٹھی میں جھونک دیتے۔ آگ پر اپنے گلاس سے چند قطرے ٹپکاتے اور "زرتشت! زرتشت" پکارتے۔

کمرہ کی فضا سگرٹوں کے دھوئیں اور شراب کے بخارات سے بوجھل تھی۔ لیکن "تننا ہُو یا ہُو" کا وِرد جاری تھا۔

ہم سوئے تو دو بج رہے تھے۔ جاگے تو چھ بجے ہوں گے۔ لیکن نہ سروں میں گرانی تھی نہ آنکھوں میں رتجگا۔ اپنی دس سالہ دوستی کے دوران میں، میں نے پہلی بار شراب میں سعادت کا ساتھ دیا۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور آخری محفل تھی۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

سعادت نے اپنا ایک مجموعہ، ایک خالی بوتل سے منسوب کیا ہے۔ اس محفل کی یاد کو میں اُن چھوٹی بڑی خالی بوتلوں سے منسوب کرتا ہوں جو تیرہ اور چودہ دسمبر ۱۹۴۲ء کو باری صاحب کے حجرے میں خالی ہوئیں۔ باری صاحب اور عباس نے ان بوتلوں کو بیچ کر یقیناً چاٹ پی ہو گی۔ لیکن میں آج بھی ان کی شراب کا سرور محسوس کر رہا ہوں۔

زخمی فصیل

دِلّی کی خاک میں ہم تین دوستوں کے بچّے دفن ہیں —— سعادت کا لڑکا عارف، میرا لڑکا سہیل اور حسن عبّاس کا لڑکا آفتاب —— کشمیری دروازے کی فصیل کے پیچھے حسن بلڈنگ ہماری زندگی کے تین حادثات کا کتبہ ہے۔ اس سہ منزلہ عمارت کے دو اُوپر تلے کے فلیٹوں ۹ اور ۱۸ سے جن کی بنیادیں ساجھی تھیں، کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی مدّت کے بعد تین بھولے بھالے بچّوں کے جنازے نکلے۔ یہ سانحے ہمارے سینوں کو، جن پہ پہلے ہی کچھ کم گھاؤ نہیں تھے اُس فصیل کی طرح زخمی کر گئے جو ۱۸۵۷ء کی یادگار تھی۔

حسن بلڈنگ کا تصوّر ہی مجھے سوگوار بنا دیتا ہے۔ عباس کے بچے پر

موت کا تشنج طاری تھا اور وہ اُسے بلانے کی کوشش کر رہا تھا:۔
"کاکاجی .....!" عباس بڑا باتونی ہے لیکن جن بلڈنگ کا ذکر آئے تو چپ ہو جاتا
ہے۔ سہیل جب سکرات میں مبتلا تھا تو عباس اُس کے سرہانے کھڑا سورۂ یٰسین
پڑھ رہا تھا۔ فلیٹ نمبر ۹ میں سعادت جب رات کو پینے بیٹھتا تو اُسے عارف
یاد آتا۔ اُس کی بڑی بڑی بے چین آنکھیں اور بھی بے چین ہو جاتیں۔ اُس کی
آواز بھرّا جاتی "اچھا بھئی خواجہ سوئیں اب"۔ اور وہ چپکے سے اندر چلا جاتا۔
یہ وہ زمانہ ہے جب اُس کے سینے میں پھر درد رہنے لگا تھا اور اُسے نیند
بہت مشکل سے آتی تھی اور اُس کے پاؤں بستر پر لیٹنے کے بعد بھی دیر تک
ہلتے رہتے تھے۔

لیکن اس زخمی فصیل کے پہلو میں اُس سہ منزلہ جہازی عمارت سے میری
اور بھی بہت سی یادیں متعلّق ہیں۔ اگر ہمارے سینے پر ان بچوں کا چرکہ نہ لگتا تو
شاید دِلّی کا دور ہماری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔

سعادت کے پاؤں کا چکّر اُسے بمبئی سے دلّی لے آیا تھا ــــ یہ ۱۹۴۱ء
کی بات ہے ــــ اب وہ آل انڈیا ریڈیو سے ڈیڑھ سو ماہانہ تنخواہ پا رہا تھا
کوئی سوا سال بعد جب اُس نے ملازمت چھوڑی اور پھر بمبئی کا رُخ کیا تو اس
کی تنخواہ قریب قریب دُگنی ہو چکی تھی۔ اور کروڑوں کان ریڈیو کے ذریعہ
اُس کے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔ اب وہ "منٹو" تھا۔ "سعادت" کو صرف

اُن کے احباب اور گھر کے لوگ جانتے تھے۔

۱۹۴۱ء میں مجھے بھی یونیورسٹی کی طرف سے بی۔اے کی ڈگری عطا ہو چکی تھی۔ سرکاری نوکری پر میرا "حق شفعہ" تھا۔ پیشہ آبا قیام امن تھا۔ لیکن سُرخ انقلابات کے نیلے نقشے بنانے والے "اشتراکی ادیب" کے حلقہ فکر میں پرورش پانے والا کس طرح ظلم و استبداد کی روایات کی پرورش کرسکتا تھا جو سرکارِ انگریزی کی پولیس سے منسوب تھیں۔ لیکن ریڈیو ابھی نیا نیا پر پُرزے نکال رہا تھا۔ جنگ کی وجہ سے "برلن کے ڈھنڈورچی" ہٹلر کے نام کا ڈنکا بجا رہے تھے۔ انگریز کے آل انڈیا ریڈیو میں بھی نشر و اشاعت کے نقاروں کے لئے نوجوانوں کی کھال درکار تھی۔ لیکن "ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود بکف نہادہ" کے مصداق ہر ڈگری یافتہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ شکاری کی نگہِ انتخاب اُس پر پڑے گی۔ ریڈیو اُن دنوں کوہِ قاف کی طرح ہوشربا تھا۔ پریاں، موسیقی، رقص، ناٹک — اختری بائی فیض آبادی، انوری بائی آگرے والی دینا پانی بہادری، دیپالی تعلقدار، غرض راجہ اندر کا اکھاڑا تھا اور خوش نصیب تھے وہ لوگ جن کی یہاں رسائی تھی۔ ان سیفد، سانولی زیتونی پریوں کے علاوہ اُستاد عبدالعزیز خاں[1] بین کار، اُستاد عبدالکریم خاں[2]، اُستاد فیاض خاں[3] جیسے ساحر

---

[1] اُستاد عبدالکریم کی زبان ٹھیک طرح کام نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے وچتر بین ایجاد کی جس کی آواز انسانی لحن کی آئینہ دار تھی۔ [2] کرانے کی گائیکی کے ترجمان۔
[3] آگرہ سکول آف میوزک کے ترجمان۔ بول بانٹ ان کا خاص کمال تھا۔

موجود تھے۔ جو پیتل اور لوہے کے تاروں سے لحن داؤدی کی نقل اُتارتے تھے۔ جن کی ہر تان "غیرت ناہید" تھی اور جن کی بول بانٹ سے رقاصۂ فلک اپنے توڑے بھول جائے اور گھنگرو اتار پھینکے ــــــ اس کے علاوہ یہاں "انارکلی" کی غلام گردشوں میں سلیم اپنی نادرہ کی محبت میں آہیں بھرتا سنائی دیتا تھا ــــــ "انارکلی، میری نادرہ"۔ "سلیم، میرے شہزادے"۔ وہی ویرا کی فضا تھا۔ وہی رومان۔ اُس وقت کون جانتا تھا کہ اس کوہ قاف میں ایسے ایسے غار ہیں جہاں سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اِس دشتِ ندا میں ہر قدم پر سراب ہیں۔ اس کے چشمے پیاس نہیں بجھا سکتے۔

ــــــ خیر ایک کشش تھی جو مجھے گورو کی بستی سے مغلوں کی دِلّی میں کھینچ لائی۔ سوچا اور کچھ نہیں تو دوست سے ملاقات ہی ہو جائے گی اور کون جانے کہ روزگار کی کوئی سبیل بن جائے۔ سعادت نے لکھا تھا۔

"سوچو نہیں۔ چلے آؤ"۔ وہ ہمیشہ سے کر گذرنے کا قائل تھا۔ کہانی پڑھنا آسان ہے، لکھنا مشکل۔ سعادت نے ہر روز ایک کہانی کے حساب سے بھی افسانے لکھے ہیں۔ دلّی آنے سے پہلے وہ مجھے بمبئی سے بھی اسی قسم کے دعوت نامے بھیج چکا تھا۔

"سپنوں کے جال نہ بُنو۔ اِن میں تم ایسی مچھلیاں پکڑ سکو گے جو ہاتھوں سے پھسل جائیں گی۔

یہاں آؤ اور دیکھو کہ زندگی سے کندھا رگڑنے

میں کتنا مزا ہے ۔"

وہ دِلّی کے سٹیشن پر میرا انتظار کر رہا تھا

"آآ آ خواجہ!" اور وہ میرا اسباب اُتروانے لگا۔ دو سُوٹ کیس تھے

اور ایک بستر۔

"میرا آخری خط نہیں ملا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

اُس نے لکھا تھا باقر خانیاں لیتے آنا۔ ٹوکری کی ٹک ٹک سے بچنے کے لئے میں نے باقر خانیاں ایک جستی سوٹ کیس میں ڈال لی تھیں۔ سعادت کو معلوم ہوا کہ اُس کی فرمائش پوری ہو چکی ہے تو اُس نے "خواجہ ابو سعید قریشی زندہ باد" کا نعرہ لگایا گیا۔ وہ نجیب الطرفین کشمیری تھا۔ امرتسر کا کشمیری۔ باقر خانی، روغنی روٹی، میٹھی اور نمکین ختائیاں، سری پائے، نمکین چائے۔ امرتسر کے کشمیریوں کے دستر خوان کی نعمتیں تھیں، سوغاتیں!

"صفیلوں میں حسن بلڈنگ" سعادت نے تانگے والے کو پتہ بتایا۔ دِلّی کا تانگے والا فصیل کی 'ف' کو ہمیشہ 'ص' سے بدل دیتا تھا چنانچہ صفیل غلط العوام فصیح تھا ـــــ سعادت، حسن بلڈنگ کے فلیٹ نمبر ۹ میں رہتا تھا۔ صفیہ (سعادت کی بیوی) نے دروازہ کھولا۔ اور میری بیوی کے بارے

میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئی۔ "وہ بھی آجائے گی"۔ میں نے جواب دیا۔ "پہلے کچھ سبیل بن جانے دیجئے"۔

"تو گھر سے نکلا ہے تو اب سبیل بھی بن جائے گی خواجہ۔ اور ہاں یار اب بھی لگتی ہے محرم کی سبیل کٹڑہ کنہیا میں"۔[1]

"دیکھ دیکھ دیکھ کدھر سے کدھر لے گیا ہے بات"۔ سعادت کی بہن ناصرہ اقبال نے کہا۔

"کیوں لگا نہیں کرتی تھیں محرم میں سبیلیں؟ — اور ہاں بھئی صفیہ باقر خانیاں آگئی ہیں تیرے لئے"۔

"کہاں ہیں؟" صفیہ کی نگاہیں میرے سامان میں وہ مروجہ ٹوکری ڈھونڈ رہی تھیں جس میں عام طور پر اِس قسم کی سوغاتیں لائی جاتی ہیں۔ لیکن ٹوکری نظر نہ آئی۔

"کدھر ہے ٹوکری۔ تانگے میں تو نہیں رہ گئی؟" صفیہ نے ذرا فکرمندانہ لہجہ میں کہا۔

"یہیں ہے لیکن تم نہیں دیکھ سکتیں"۔

"ارے بھول گئے ہوں گے بیچارے"۔ صفیہ نے میری وکالت کی۔

---

[1] کٹڑہ کنہیا امرتسر کا بازارِ حسن تھا۔ یہاں محرّم کے دنوں خوب چہل پہل ہوتی۔ طوائفیں کالے کپڑے پہن کر گھوما کرتیں۔ اُنھیں نئے لباس میں دیکھنے کے لئے لوگ باگ اپنے راستے بدل کر ادھر سے گذرتے۔

چند سیکنڈ اور اسی طرح بج رہی۔ اس کے بعد سعادت نے اپنے خاص ڈرامائی انداز میں، جو اُس کی کہانیوں کی خصوصیت ہے، اُس جستی سوٹ کیس کا راز فاش کیا جو میرے چمڑے کے سوٹ کیس کے پاس پڑا تھا۔ ۹ حسن بلڈنگ کا صحن قہقہوں سے گونج اُٹھا —— اُس نے ایک بظاہر ناقابلِ توجہ بات کا کاٹھی افسانہ بنا دیا تھا۔ اُس کے افسانوں کا یہ خاصہ ہے کہ اُن کے انجام کے بارے میں قاری قطعی طور پہ بے خبر ہوتا ہے۔

"اب چاء پی لیجئے پہلے۔ ٹھنڈی ہو جائے گی نہیں تو" آپا صفیہ نے کہا۔

آپا صفیہ سے میری دوسری ملاقات تھی۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہم ایک ہی گھر میں پلے بڑھے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کی بات ہے امرتسر میں خبر اُڑی کہ سعادت شادی کر رہا ہے —— کسی فلم ایکٹرس سے —— وہ اُن دنوں بمبئی میں تھا۔ فلمی دنیا سے اُس کا گہرا تعلق تھا۔ وہ "ہفت روزہ مصوّر" کا ایڈیٹر تھا۔ اُس کی ایک کہانی بھی فلمائی جا چکی تھی۔ یا شاید فلمائی جانے والی تھی۔ اس کا نام غالباً "کسان کنیا" تھا۔ اس میں غلام محمد نے ایک ایسے بدمعاش کا پارٹ ادا کیا تھا جس کی روح تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ یہی ڈرامہ بعد میں رندھیر پہلوان کے ریڈیائی روپ میں بار بار براڈ کاسٹ ہوا۔ لیکن بات کہاں سے کہاں نکل گئی میں کہہ یہ رہا تھا کہ امرتسر میں اڑ رہی تھیں کہ ٹامی شادی کر رہا ہے۔ کسی فلم ایکٹرس سے اُس کا تعلق جائز یا ناجائز

فلمی دنیا سے تھا۔ اور چونکا دینے والی بات کہنا اُس کی سرشت میں شامل تھا۔ جو[1]
شخص کلمہ پڑھ کر ماسٹر اللہ رکھا کے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنے کی جرأت
کر سکتا تھا، اُس سے کچھ بعید نہ تھا۔ تاہم یہ خبر سن کر مجھے بھی اچنبھا ہوا۔ میں نے
اُسے لکھا۔ "سنا ہے تمھاری شادی ہو رہی ہے۔ کسی فلم ایکٹرس سے یہ کیا
قصہ ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "تم نے صحیح سنا ہے کہ میری شادی ہو رہی
ہے اور غلط سنا ہے کہ فلم ایکٹرس سے۔ میری ہونے والی بیوی ایک سیدھی
سادی گھریلو لڑکی ہے۔ میری طرح وہ بھی عینک لگاتی ہے اور اس کی
ماں بھی عینک لگاتی ہے......"

وہی سیدھی سادی گھریلو لڑکی، عینک لگائے اب ۹ حسن بلڈنگ کے
برآمدے میں ناشتہ کی میز پر بیٹھی ہمارے لئے توسوں کو مکھن لگا رہی تھی۔ میز
پر گوالیار پاٹریز کا ایک ہلکے سبز رنگ کا ٹی سیٹ تھا۔ گوالیار کے برتن ان
دنوں ابھی نئے نئے آئے تھے چنانچہ جدت سمجھے جاتے تھے۔ اور اُس کی
زندگی تو تھی ہی سراپا جدّت۔ ہمارے پیر و مرشد باری صاحب اکثر گنگنایا
کرتے تھے ـــ "طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم"۔ جدت پسندی
منٹو کی جان تھی اور اک زمانہ وہ آیا کہ منٹو خود جدّت کا نشان بن گیا۔ سبز اور
سفید رنگ کا میز پوش برتنوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ اُس میز کی بلکہ اُس

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے نقوش کے شخصیات نمبر میں حامد جلالی کا مضمون منٹو ماموں دیکھیے

گھر کی ہر چیز ہم آہنگ تھی — آپا صفیہ کسی بچے کی طرح باقر خانی کھانے میں مصروف تھی۔ سعادت کی طرح وہ بھی کشمیری الاصل تھی — اُس کے والد افریقہ میں انسپکٹر پولیس تھے۔ ایک روز کھانا کھا رہے تھے کہ کسی بلوے کی اطلاع ملی۔ یہ کہہ کر گئے کہ ابھی آتا ہوں۔ مگر کسی حبشی نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ صفیہ کے تایا وہاں کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ میں نے اُن کی تصویر دیکھی ہے۔ اتاترک کا ڈبل سمجھ لیجئے۔ وہی عقابی ابرو، وہی پیشانی، وہی آنکھیں — جب سعادت کے رشتے کی بات چل رہی تھی تو لڑکے کو دیکھنے کے لئے افریقہ سے آئے۔ اور سعادت بتا رہا تھا۔ "کوئی آنکھیں ہیں خدا کی قسم۔ کپڑے اتارتی ہوئی ایکس ریز کی طرح آر پار ہو جاتی ہیں۔" باپ کی آنکھوں کی طرح تایا سُسر کی آنکھیں بھی اسے محاسبہ کرتی دکھائی دیتی ہیں — "دیدہ خواہد شد!" منصف صاحب کا باغی بیٹا، قانون ساز کی بھتیجی اور قانون کے محافظ کی بیٹی کو بیاہ لایا۔ شادی بمبئی میں ہوئی۔ لڑکی والے ماہم میں رہتے تھے اور لڑکا کلیئر روڈ پہ —

میرے پاس سعادت کے اُس زمانے کے سب خطوط محفوظ تھے۔ بٹوارے میں جب میرے مکان کو نذرِ آتش کیا گیا تو وہ بھی راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ مگر اُن کے دائیں کونے پر لکھا ہوا پتہ اب بھی مجھے یاد ہے — "۱۷ اڈیلفی چیمبرز کلیئر روڈ بمبئی ۸" مگر میں ۹ حسن بلڈنگ، نکلسن روڈ، دلی کی بات کر رہا تھا۔ تین کمروں کا یہ مختصر مکان منٹو کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ اس کے

برآمدہ کے سامنے جہاں ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ منٹو کا ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے گلی پر کھلتی ہوئی کھڑکی کے پاس ایک مختصر سا صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ اس کے دائیں جانب، کونے میں، الماری کے پاس بُک شیلف۔ صوفہ سیٹ کے سامنے ایک فرشی ڈیسک۔ اِس کے پاس فرش پر گدا بچھا ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ وہی گاؤ تکیہ جسے باری صاحب "علی اللہ" کہا کرتے تھے۔ دارا کی طرح وہ اپنی مفلسی کے اِس دوست کو جس کے سہارے وہ دارالاحمر میں اپنی کمر سیدھی کیا کرتا تھا، اپنے ساتھ ساتھ لئے پھر رہا تھا۔ سامنے ڈیسک پر شیشے کے قلمدان میں زنگار رنگ کی پنسلیں چمک رہی تھیں۔ دو تین قسم کے پیڈ تھے جن کے کاغذ اُس کی نفاست پسندی کا ثبوت تھے۔ ڈیسک کے پاس بائیں ہاتھ کی الماری میں اُس کے ٹائپ رائٹر پڑے رہتے تھے۔ انگریزی کی مشین تو خیر کبھی کبھار ہی استعمال ہوتی تھی، ہاں اُردو کی مشین پر اُس نے ہزاروں صفحے لکھے ہوں گے —— آل انڈیا ریڈیو دِلّی کے پرانے دفتر میں، جو ۱۸ انڈرہل روڈ پر واقع تھا۔ یہ مشین ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی تھی۔

ناشتہ ہو چکا تو سعادت نے کہا: "آؤ بھئی خواجہ اب ذرا دفتر ہو آئیں"

اُس نے اپنا ٹائپ رائٹر اُٹھایا اور ہم نے انڈرہل روڈ کا رُخ کیا۔

سڑک کے ایک طرف آل انڈیا ریڈیو کے سٹڈیو تھے اور دوسری طرف سٹیشن ڈائریکٹر کا دفتر۔ یہی وہ کوہِ ندا تھا جس کی آواز سن کر مجھے اسے دیکھنے

کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

"کرشن چندر ایم۔اے، اوپندر ناتھ اشک شری ایک سو آٹھ!

ن۔م۔ راشد! بہزاد لکھنوی، دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے! لالہ حفیظ جالندھری

— ہاں تو بعض نسخوں میں یوں بھی آیا ہے!......" وہ اپنے رفقائے کار سے

میرا تعارف کرا رہا تھا۔ ہر شخص نے مجھ سے یہی کہا ——— "سو آپ آ گئے۔"

وہ اُنھیں میری آمد کی اطلاع پہلے ہی دے چکا تھا "MY FRIEND HARIN!"

ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، سروجنی نائیڈو کا بھائی، اُن دنوں CURD SELLER[1]

کا بہروپ بھرے اپنا دماغ فروخت کر رہا تھا۔ کچھ مدت بعد 'منصوروں' کی اس

دنیا میں رفیع پیر بھی آ گئے۔ اُنھیں اب تک ایسا کوئی مُرید نہیں مل سکا تھا جو

اُن کے لئے ہندوستان کی سرزمین پر REINHARDT[2] کا سٹیج قائم کر سکے

اور اُن کی ڈرامائی صلاحیتوں کو پنپنے کا موقعہ مل سکے۔

اتنے 'دیوانے' شاید ہی کبھی یکجا ہوئے ہوں گے۔ ہر شخص 'انا الحق' کا نعرہ لگا رہا تھا۔ یونان کے سنہرے دور کے دیوتاؤں کی طرح ان میں عجیب و غریب قسم کے ہنگامے رہتے۔ ہر کوئی یہ کہتا سنائی دیتا کہ میں بڑا خدا ہوں۔ میں بڑا خالق ہوں۔ دیوتاؤں کی اس خانہ جنگی سے ادب و فن کی دنیا مالا مال ہو رہی

---

[1] ایک ریڈیائی فیچر جسے چٹوپادھیائے خود لکھتا اور خود ہی پیش کرتا [2] جرمنی کا مشہور سٹیج پروڈیوسر جس کی ہر پیشکش پر لاکھوں خرچ آتا تھا۔ رفیع پیر اُس کے شاگرد تھے۔

تھی۔ ان کے رشک ورقابت میں ماؤنٹ اولمپس[1] کی عظمت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایلیڈ اور اوڈیسی[2] کے کردار زندہ ہو گئے۔ ہومر[3] کو آنکھیں مل گئی ہیں یا پھر ہندو دیومالا کے کردار سمندر کو بلو کر امرت نکالنے میں مصروف ہیں ——
اس دور میں منٹو نے جو کام کیا اگر اُس کو نظر انداز کر کے ایک "جیب کترا" ہی کو لے لیا جائے تو اُس کی عظمت کے قیام و بقا کے لئے بہت ہے۔

آل انڈیا ریڈیو دلّی کا کوہِ ندا ان خداؤں کے نعرۂ خودی سے گونج رہا تھا۔ انھیں اپنی مخلوق سے محبّت تھی۔ چنانچہ یہ اپنے آسمانی نشیمن چھوڑ کے زمین پر اُتر آتے اور انسانوں سے دل بہلاتے۔ بچّوں کی طرح وہ اپنے اپنے بنائے ہوئے کھلونوں سے کھیلتے اور خوش ہوتے —ایک دن چٹو پادھیائے نے کہا:

"COME QURESHI, I WILL INTRODUCE YOU TO MY WIFE"

وہ جمنا کے کنارے ایک بنگلہ میں رہتا تھا جس کا نصف حصّہ کسی اور کے پاس تھا۔ شام کے دھندلکوں میں ہم سنسان سڑکوں سے ہوتے ہوئے اُس کے گھر پہنچے۔ وہ اِن احمق لوگوں کو کوس رہا تھا جو بزعمِ خود آرٹ کی سرپرستی فرما رہے تھے اور کسی کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ مسودوں کی تعداد اور نشریات کی گنتی سے کرتے تھے۔ جو شعر کو نون تیل لکڑی کے ترازو میں تولتے تھے جنھوں نے

---

[1] یونانِ قدیم کی دیومالا میں دیوتاؤں کا مسکن [2] ہومر کی تصانیف [3] ہومر نابینا تھا۔

آرٹ کی تخلیق کے لئے وقت کی قید لگا رکھی تھی اور چاہتے تھے کہ فیکٹری کے مزدوروں کی طرح فن کار بھی بھونپو کی آواز پہ رقص کریں "THE IDIOTS"

——لیکن ہم اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچ چکے تھے۔ اپنے گھر کی روشنی دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں: "HERE WE ARE!"

"MEET MY FRIEND" اُس نے اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا۔ وہ سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی سیتا دیوی۔ خاموش فلموں کی ہیروئن۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نگار خانوں کی تمام فلڈ لائٹس کی روشنی اُس کی سفید ساڑھی کی سلوٹوں میں جذب ہو گئی ہے۔ اُسے پردۂ سیمیں سے علیٰحدہ ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر وقت کا کوئی سایہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی جمنا اشنان کر کے آئی ہے اور کسی مندر میں آرتی اتارنے کی تیاری کر رہی ہے، کچھ لوگ کہتے تھے کہ اُس سے چٹو پادھیائے کا رشتہ مذہب کی مقدس آگ کے سحر سے بے نیاز تھا۔ مگر اُس کا پتی اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی سچ مچ کی دیوی کو دیکھ رہا ہو۔ نہ جانے اُس کے آئینہ میں اُسے اپنے کس خیالی پیکر کا عکس نظر آرہا تھا۔

"غالب کی غزل سنو گے قریشی!" چٹو پادھیائے نے کہا۔

"ضرور!" میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سیتا دیوی گائے گی۔

"مجھے اُردو بھی آتی ہے اولڈ بوائے۔"

"لیکن غالب؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہوں!" اُس نے خاص ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔" باجہ ۔ بینتا!"

باجہ آگیا اور اُس نے قوالی کی لَے میں غزل چھیڑی۔ شاید ۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

اُس کی آواز کچھ ایسی ہی تھی اور گانے میں کہیں کہیں جدید بنگالی سنگیت کا اثر جھلک رہا تھا۔ لیکن تلفظ درست تھا۔ ہاں لہجہ ضرور اس بات کی غمّازی کر رہا تھا کہ وہ اُردو کا عادی نہیں ہے۔ مگر وہ کمال انہماک سے گا رہا تھا اور سیتا دیوی مورتی کی طرح چپ چاپ سامنے بیٹھی تھی۔ مغنّی کا اشتیاق تانوں کی شکل میں تصدق ہو رہا تھا لیکن اُس کی محبوبہ کی آواز میں نے نہیں سنی تھی۔ اور میں غالب کی زبان میں سوچ رہا تھا ۔ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"

خیر غزل کے بعد اُس نے [illegible] پا مانجھی کا گیت سنایا۔ جس کا ریکارڈ میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ باجہ بند ہوا۔ میں نے اجازت چاہی۔ سیتا دیوی بدستور خاموش تھی۔۔

منٹو کہا کرتا "چھوٹا پادشا ہے فراڈ ہے "HE IS AN ACTOR

اُس کی اصطلاح میں کرشن چندر، راشد، لالہ جاوید ...... سب فراڈ تھے۔" اور میں ان سب سے بڑا فراڈ ہوں۔"

وہ کہا کرتا ہیں معمولی سے معمولی واقعہ کا افسانہ بنا سکتا ہوں۔ اِس لیے افسانہ نگاری فراڈ ہے۔ جو شخص افسانے کی ٹیکنیک سے واقف ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک بظاہر کم حیثیت حادثہ کا افسانہ بنا دے۔ درحقیقت یہ بھی اُس کی تعلّی کا ایک پہلو تھا۔ ورنہ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ کام ایسا سہل نہیں۔ اگر ٹیکنیک کے بل بوتے پر افسانے لکھے جا سکتے یا شعر کہے جا سکتے تو ہر نقّاد شاعر اور داستان گو ہوتا۔ درست کہ اسلوب بیان بہت اہم چیز ہے لیکن شعر گوئی اور افسانہ نگاری کے اصول اور قوانین سامنے رکھ کر شعر و ادب کے شاہکار تخلیق نہیں ہوتے۔ صنائع و بدائع کے دفتر کھول کر آپ ذوق کی طرح "مسجد و تالاب" تو بنا سکتے ہیں، غالب کا ایک مصرع نہیں کہہ سکتے۔ ٹیکنیک لاکھ اہم سہی لیکن وہ نظر ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی جو سپاٹ واقعات میں بھی افسانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ بہار روزِ آفرینش سے آتی رہی ہے اور آتی رہے گی۔ لیکن میر سے پہلے زنجیر[1] کتنوں کو نظر آئی ہوگی۔ لیکن اب کہ وہ زنجیر بن چکی ہے۔ چاہے عمر بھر بیٹھے اس کی کڑیاں گنتے رہیے ـــ آرٹسٹ اور لوہار کبھی ایک صف میں نہیں بیٹھ سکتے! ٹیکنیک کے لفظ کے ساتھ مجھے بھی "تکلف" کا احساس ہوا ہے۔ مگر آپ منٹو، ماپاساں یا ماہم کی کہانیاں پڑھ جائیے شاذ ہی تکلف کا احساس ہوگا۔ بس یہی محسوس ہوتا ہے جیسے باتیں ہو رہی ہیں حتیٰ کہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ اب بیٹھے سوچتے رہیے کہ یہ کیا ہو گیا۔ منٹو کے

---

[1] پھر موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی ۔ شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

افسانوں کا "میں" خالی خولی قصّہ گوئی کی سہولت اور ایک ماہرِ فن کی اُستادی ہی نہیں۔ مشاہدہ ہے، سرگذشت ہے — " بڑھا بھی دیتے ہیں زیبِ داستاں کے لئے"۔ میں کا ذکر آیا تو مجھے منٹو کی اَنا کے بارے میں ایک دوست کا مضمون یاد آ گیا، جس میں کافی محنت سے اِس "میں" کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس وقت مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ مختار صدیقی نے اپنی اِس تحقیق سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منٹو کی خودستائی اور خود نمائی شاید اُس لاپرواہی کا ردِ عمل تھی جس کا اُسے بچپن میں تجربہ ہوا تھا۔ دور کے رشتہ داروں کو تو چھوڑیئے اُس کے سوتیلے بھائی بھی، جن کی رگوں میں بھی منصف صاحب کا خون دوڑ رہا تھا، اُسے بھائی کہنے سے کنیاتے تھے۔ لیکن سعادت جب منٹو بن گیا تو وہ اُس سے ملنے لگے۔ حسن بلڈنگ کے فلیٹ نمبر ۹ میں، میں نے اُس کے بڑے بھائی سلیم کو بھی دیکھا، جو اُس کے تین سوتیلے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ کوچہ وکیلاں امرتسر میں سلیم اور سعادت کی اکثر جنگ رہتی تھی۔ مگر اب سعادت، منٹو بن چکا تھا اور سلیم، سلیم بھائی جان — اُس کو یہ سارے رشتے ناتے، یہ سارا معاشرہ فراڈ نظر آ رہا تھا۔ سعادت کو جاننے والے بہت کم تھے۔ منٹو کو ہر کوئی پہچانتا تھا۔ محبّت کے بھوکے انسان کو، دوستوں کے سوا کسی نے سینے سے نہ لگایا۔ افسانہ نگار کی عظمت و شہرت کے سامنے سبھی سرجھکا رہے تھے۔ یہ 'فراڈ' نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

اس نے انتقاماً خود کو بھی 'فراڈ' کہنا شروع کر دیا۔ اس سے مجھے آندریف کا "چپت خورا" یاد آ جاتا ہے۔ ہر وہ چپت جو اُس کے گال پر گونجتی ہے' معاشرے کی ریاکاری کے چہرے پر ایک چانٹا ہے۔ معاشرہ جو اصل کو نقل سے الگ نہیں کر سکتا۔ معاشرہ جو اُسی کو مانتا ہے جو اُس کے منہ پر چانٹا مار سکتا ہے۔ درویشوں کے لیے ہماری دنیا میں کوئی جگہ نہیں ——— مگر بات کہاں کی کہاں پہنچ گئی۔

میں آل انڈیا ریڈیو دلّی میں منٹو کے رفقائے کار کا ذکر کر رہا تھا۔ راشد، کرشن، اشک، چٹو پادھیائے ——— ریڈیو اُس وقت بھی ایک نیا 'میڈیم' تھا ——— صرف آواز۔ قارئین کو صفحوں باغ کی سیر کرانے والے یا ہیروئن کی خواب گاہ کی درزوں سے جھانکنے والے اگلے وقتوں کے ادیب اور افسانہ نگار آواز کی دنیا میں بیکار ہو کر رہ گئے۔ بادلوں لہرا کر رگیں پھیلا کر، گرجنے برسنے والے مکالمہ نگار، مائیکروفون کے سامنے سارے بھاؤ بھول گئے۔ زمانہ بدل چکا تھا ——— لیکن منٹو نے، جس کی ہر ادا نرالی تھی اور جو اپنی جدّت طرازی کے اظہار کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا، ریڈیو کے اندھے سٹیج کے پردوں کو اپنے ٹائپ رائٹر کے رولر پر کاغذ کی طرح لپیٹ لیا۔ ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سے اُس نے صوتی تمثیل کے ایسے ایسے تجربے کیے کہ سامعین گوش برآواز رہنے لگے۔

ان میں 'جرنلسٹ'، جیسا طنز بھی تھا جس سے اخباری دنیا میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ 'جیب کترا' جیسی ٹریجیڈی بھی تھی، جس میں محبت کا معجزہ ایک پیشہ ور جیب کترے کے دل میں سوئے ہوئے انسان کو جگا دیتا ہے۔ اور انھیں میں 'نیلی رگیں' بھی تھا جس کے شاعرانہ اشارے بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ جب تک وہ آل انڈیا ریڈیو دلی میں رہا ہر ہفتہ دو تین مسودے لکھتا رہا۔ ان میں برلن ریڈیو کے جارحانہ پروگراموں کے جواب بھی ہوتے اور خالص ادبی ڈرامے بھی۔

بڑے ڈراموں کے ریہرسل عام طور پر براڈ کاسٹ سے تین دن پہلے شروع ہوتے تھے۔ ٹائپ شدہ ڈرامہ پروڈیوسر کو ہمیشہ وقت سے پہلے مل جاتا۔ پروڈیوسر سے مشورہ کرنے کے بعد کرداروں کی تعداد کا پہلے ہی تعین ہو چکتا تھا۔ ڈرامہ لکھتے وقت ایکٹروں کی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ تاکہ کوئی ایسا کردار نہ آجائے جو موجودہ ایکٹروں کی حدودِ اداکاری سے باہر ہو۔

پروگرام کے رسالوں 'آواز اور انڈین لسنر' وغیرہ میں ڈراموں کی تفصیل تاریخِ نشر سے بہت پہلے بھیج دی جاتی تھی۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ پروگراموں کی تفصیل رسالوں میں بھیجنے سے پہلے سب مسودے تیار ہوتے اور ان کے موضوع، ٹیکنیک، کردار اور میعاد وغیرہ محکمانہ منظوری حاصل کر چکے ہوتے لیکن منٹو چیونٹی کی طرح برسات کی فکر کب کرتا تھا۔

اُس کے ذہن میں وقت کا صرف ایک تصور تھا — حال! — وقت کے ساتھ دوڑ لگانے میں اُسے مزہ آتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ جیت جاتا۔

کرشن یا جاوید پوچھتے کہ بھئی اب کے کونسا ڈرامہ جائے گا تمھارے نام سے؟ عنوان بتاؤ۔ وہ جواب دیتا "جو جی میں آئے لکھ دو"۔ چنانچہ مختصر سی بحث کے بعد کوئی عنوان دے دیا جاتا اور تاریخ نشر سے کوئی ہفتہ بھر پہلے تک سب بھول جاتے کہ وہ سامعین سے کیا وعدہ کر چکے ہیں۔ سبھی جانتے تھے کہ وعدہ خلافی کبھی نہیں ہوگی۔ جب مسودہ دینے کے دن قریب آتے تو منٹو اپنا ٹائپ رائٹر کھولتا۔ پاؤں کے بل کرسی پر بیٹھ جاتا اور ایک اُنگلی سے حروف ڈھونڈتا ڈھونڈتا تمثیل مکمل کر دیتا۔

ڈرامے اور فلمی کہانیاں وہ ٹائپ رائٹر پر لکھتا تھا۔ ہاں افسانوں کے لئے پنسل یا فاؤنٹن پین استعمال کرتا۔ لیکن اُس کی بظاہر الجھی ہوئی شخصیت اور کھوئی ہوئی باتوں کے باوجود اُس کے خیالات اِس قدر منظم تھے اور اُس کا اندازِ تفکر اِس درجہ مربوط تھا کہ شاید ہی کوئی لفظ یا جملہ کاٹتا ہوگا۔ اُس کے مسودے دیکھیے تو یہی افسوس ہوتا ہے جیسے اُس نے کسی لکھے لکھائے افسانے کو اپنے خط میں کاغذ پر اُتار لیا ہو۔ لکھتے وقت اُسے کسی گوشۂ عافیت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر بات زیچ کیست کرتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کو کبھی پُراسرار بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے گناہ بھی کیے تو

اعلانیہ کہے شراب پی تو منہ میں الائچی نہ ڈالی کہ اُس کی بُو نہ سنگھائی دے۔ رنڈی کے ہاں گیا تو منہ پر مفلہ نہ لپیٹا۔ لکھنے کے بارے میں اُس نے ایک بار کہا تھا کہ میں مرغی کی طرح چھپ کر انڈا نہیں دیتا۔ لکھتے وقت بظاہر وہ اپنے ماحول سے بالکل بے خبر ہو جاتا۔ ناسوت و لاہوت کے تمام رشتے منقطع ہو جاتے۔ مگر بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ وہ باتیں بھی کرتا جاتا اور ساتھ ساتھ کام بھی کیئے جاتا۔ اُس کے خیالات کو غیر متعلقہ باتوں سے منتشر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تخلیقی انہماک کے باوجود وہ مطلب کی بات ضرور سن لیتا تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن وہ سب کچھ سن رہا ہوتا اور سمجھ رہا ہوتا۔ اُس کی چھٹی حس بہت بیدار تھی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں اگر کوئی اُس کے بارے میں بات کر رہا ہوتا تو اُسے فوراً پتہ چل جاتا۔ دارالاحمر میں ہم لوگوں نے یہ بارہا آزمایا تھا۔ اُسے کام میں منہمک دیکھ کر ہمیں شرارت سوجھتی اور ہم سرگوشیوں میں اُس کے خلاف باتیں کرنے لگتے۔ ایسے میں اُس کے ہونٹوں پہ ایک خاص قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوتی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں عینک کے فریم سے باہر نکل آتیں اور وہ آستین چڑھانے لگتا اور کمرہ ہمارے "او فراڈ" کے نعرے سے گونج اُٹھتا۔ انڈیرہل روڈ پہ بھی اُس کا یہی عالم تھا۔ دیوانوں کی اس دُنیا میں جہاں حریفانہ چشمکوں کی گرم بازاری تھی۔ وہ اپنے ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک کے درمیان بھی جوابی حملوں،

سے کبھی نہ چُوکتا۔ اُس کے یہاں طنز و مزاح کا بھی ایک خاص معیار تھا
کسی کی ذات پر اُس نے کبھی حملہ نہیں کیا تھا۔ جو شخص بھڑووں، رنڈیوں،
قاتلوں اور چوروں میں بھی اِنسانیت کے باقیات تلاش کر رہا ہو اُس سے
بعید تھا کہ اِنسان کی توہین کرے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ اُس کے مزاح میں بھی ایک جدّت ہوتی
تھی۔ اِس سے مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ راؔشد سے اُس کی خوب نوک جھونک
رہتی تھی۔ اِنہی دنوں آل انڈیا ریڈیو دلّی میں ایک نیا پروگرام اسسٹنٹ آیا۔
مشہور تھا کہ اُس کے پیچھے کوئی بہت بڑی سفارش ہے۔ اُس کے مبلغِ علم
کا یہ عالم تھا کہ "طوائف الملوکی" اور "PROSTITUTION" اُس کے
نزدیک ہم معنی الفاظ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ یار لوگ اُس کی
تائید کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے اُسے یہ کہہ کر شک میں ڈال دیا کہ لوگ بااگ
تمھیں بنا رہے ہیں۔ مگر صاحب وہ کم از کم "طوائف" کا مطلب تو سمجھتا
ہی تھا۔ ایسے میں اتنی بڑی غلطی اُس سے کیوں کر سرزد ہو سکتی تھی؟ اُس
نے لالہ جاوید سے رجوع کیا — اپنی دو ایک کمزوریوں کو چھوڑ کر لالہ جاوید
بڑے رکھ رکھاؤ کا آدمی تھا۔ با ذوق، وضع دار۔ وہ آل انڈیا ریڈیو دلّی
کا بہترین پروڈیوسر تھا۔ وہ نہایت ہی شستہ و رفتہ اُردو بولتا اور لکھتا تھا۔
اُس کی بے تکلّفی میں بھی ایک خاص قسم کا تکلّف ہوتا۔ غیر سفارشی پروگرام اسسٹنٹ

کو یقین تھا کہ کم از کم وہ اُسے نہیں بنائے گا۔ چنانچہ جب جاوید نے بھی اُسی کے مطالب کی تائید کی اور کہا کہ مستند لغات میں 'طوائف الملوکی' اور رنڈی کا پیشہ ہم معنی ہیں۔ اور "لغات الجاہلین" قسم کی کسی فرہنگ کا حوالہ بھی دے دیا تو اُس کا شک جاتا رہا۔ یہ حضرت کالج میں سائیکل سواری کا کوئی ریکارڈ بھی قائم کر چکے تھے۔ اور وہ شوق اب تک قائم تھا۔ چنانچہ ریسنگ سائیکل پر دفتر تشریف لاتے۔ سائیکل کا ہینڈل اُلٹا لگا ہوا تھا اور مڈگارڈ غائب تھے۔ ایک دن سائیکل دفتر کے پچھلے برآمدے کے پاس پڑی تھی۔ یہیں منٹو کا کمرہ تھا۔ وہ باہر آیا تو سائیکل پر نظر پڑی۔

"راشد! کرشن! اشک! جاوید! چوپڑا! بہزاد ......" اُس نے سب کو آوازیں دینا شروع کیں۔ دفتر بہت مختصر تھا۔ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ جب سبھی لوگ برآمدے میں جمع ہو گئے تو منٹو نے بغیر مڈگارڈ کی سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ رہی راشد کی شاعری!"

برآمدہ قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ خود راشد بھی اُسے گالیاں دے رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔ مڈگارڈ اور قافیہ کی مشابہت اور راشد کی نظمِ معرّا! ...

..... بعد میں منٹو اور راشد کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ نئی شاعری اور نئے افسانے کے امام ایک دوسرے کا احترام کرنے لگے تھے۔ منٹو کا

انتقال ہوا تو راشد لاہور ہی میں تھا۔ چند روز بعد وہ اپنی چھٹی گذارنے کے لئے پشاور آیا۔ میں اُس سے ملنے چودھری محمد اقبال کے یہاں جا رہا تھا جہاں وہ مقیم تھا ــــــ میزبان اور مہمان صدر سے پیدل آ رہے تھے۔ وہ مجھے پشاور کلب کے سامنے، مال روڈ کے چوراہے پر ملے۔ راشد ٹھیٹ مشرقی انداز میں مجھ سے بغلگیر ہوا۔

"منٹو نوں ٹُور سُٹیا جے۔"

راشد مجھے کوئی چار سال کے بعد ملا تھا۔ چار سال کی خاموشی کے بعد یہ اُس کا پہلا جملہ تھا۔ اِن الفاظ اور اُس لہجہ کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن کچھ یوں سمجھ لیجئے جیسے وہ مجھ سے خطاب کرتے ہوئے سارے معاشرہ سے کہہ رہا ہے کہ آخر تم نے اُسے مار کے ہی دم لیا۔

یوں تو ہمارے یہاں مرنے کے بعد ہر شخص کو "رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹیوں" پر لٹکا دیا جاتا ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کا حریف بھی احترام کریں۔ منٹو سے پہلے بھی ہزاروں ادیب مرے ہیں کیونکہ موت اٹل ہے منشی پریم چند، سر عبد القادر، اختر شیرانی، تاثیر، میراجی، اقبال۔۔۔۔ یہ سب ہمارے سامنے کی بات ہے۔ بہتوں نے ان کے جنازوں میں شرکت بھی کی ہوگی۔ لیکن جتنا کچھ منٹو کے بارے میں کہا اور لکھا گیا ہے شاید ہی ــــ اقبال کو چھوڑ کر اور اقبال کو اصولاً اس فہرست میں شامل

نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انھیں تو ہم نے ان کی زندگی میں "رحمۃ اللہ علیہ" بنا دیا تھا ـــ کسی اور ادیب کے بارے میں کہا یا لکھا گیا ہو گا، نفسیاتی مطالعے، کرداروں کے تجزیے، آٹو گراف، شراب کی خاطر اُس کے قرض لینے کے قصّے۔ آج وہ سارے پاکستان کا مقروض نظر آتا ہے لاہور میں آپ کو سیکڑوں ایسے ساہوکار ملیں گے جن سے بقول اُن کے اُس نے فلاں دن شراب کے لئے پانچ یا دس روپے قرض لئے ـــ اِن لوگوں کے ظرف کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں آپ سے اُس مے خوار کی باتیں کر رہا ہوں۔ وہ لکھتا ہے۔

"مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے اور بھی نکمّا کر دیا تھا۔ آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سُکڑ گئے۔ غم غلط کرنے کے لئے میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا۔ جن کو ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اُن کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی اور روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔"

میں اس کے متذکرہ بالا دوستوں کے نام نہیں لوں گا۔ لیکن اگر کوئی عدالت ایسی بھی ہوتی جہاں منٹو کی موت کے اسباب کا جائزہ لیا جا سکتا تو اُس کے یہ دوست ضرور مجرموں کے کٹہرے میں شامل ہوتے۔ "یہ لوگ" مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں "جو منٹو کو اس لئے پلاتے تھے کہ کل کو کہہ سکیں کہ ہم نے منٹو کے ساتھ شراب پی ہے۔" مولانا کہہ رہے تھے۔ "یہ۔ یہ لوگ منٹو کی روشنی میں چمکنا چاہتے تھے۔" ان لوگوں کے کردار کے بارے میں رائے قائم کرنا کچھ ایسی مشکل بات نہیں۔ شاید 'منفی' کا لفظ ان کی فطرت کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ اس کا برعکس منٹو کے کردار کو جس لفظ سے واضح کیا جا سکتا ہے، وہ مجھے نہیں سوجھ رہا۔ "مثبت" شاید کچھ کچھ اس مفہوم کو ادا کر سکے۔ اس کی شخصیت میں ایک ایسی کشش تھی کہ طرح طرح کے لوگ اس کے گرد کھنچے چلے آتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو خود انا الحق کے نعرے لگاتے تھے اُس کی دوستی کے خواہشمند رہتے تھے۔ شاید وہ اس کی بے باکی سے ڈرتے تھے۔ وہ اس قدر بیباک تھا کہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کی تاریخِ وفات ان الفاظ میں لکھی ہے:

"وہ خوش مزاج تھا"

بظاہر یہ غیر شاعرانہ اور غیر رسمی قسم کی تاریخ ہے۔ لیکن یہ ایک

ایسے شخص کا تاثر ہے جس کا شمار اُس کے نہٹے پرانے دوستوں، کسی میں بھی نہیں ہوتا۔ اُس کا خلوص اجنبیوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ دارالاحمر کے دور میں ایک دفعہ اُسے آٹوگراف اکٹھے کرنے کا شوق ہوا تھا جس کے لئے بعض اوقات اُسے خاصی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی مگر اب کہ وہ خود اتنی شہرت حاصل کر چکا تھا کہ لوگ اس کے دستخطوں کو اپنے البموں کی زینت بنائیں، اس نے کبھی اُن کی خواہش پوری کرنے میں نخوت یا خست سے کام نہیں لیا تھا۔ کالجوں کے باذوق طلبا اور دوسرے نوجوان ادیب اکثر اُس کے یہاں آیا کرتے۔ وہ سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتا۔ تکلّف اس میں نام کو نہیں تھا۔ چنانچہ اُس کے یہاں کسی کو اجنبیت کا احساس ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے ملکوں میں اس پایہ کے ادیبوں سے ملاقات کے لئے مہینوں پہلے سکریٹری سے اُن کی مصروفیات کا پتہ کرنا پڑتا ہے اور جب جا کر ملاقات نصیب ہوتی ہے لیکن منٹو (اگر اُس کی اَنا زیرِ بحث نہ ہوتی) ایک قلندر تھا۔ ایک درویش۔ اُس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں کھڑا تھا۔ اُس سے ملاقات کے لئے کسی سکرٹری کو مطلع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔

ہم عظمت و شہرت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سعادت ابھی

منٹو نہیں بنا تھا۔ کسی مسودے کے سلسلے میں بی۔ بی۔ سی سے خط وکتابت کرنا تھی۔ خط کے نیچے مسٹر ایس۔ ایچ منٹو کے سیکرٹری، حسن عباس نے دستخط کئے۔ سیکرٹری صاحب سے بہت دنوں مذاق رہا۔ عباس کہنے لگا۔ ٹھیرو میں بی بی۔ سی والوں کو ابھی لکھتا ہوں کہ یہ مسٹر منٹو سراسر فراڈ ہے، اس کے مسودے پر بالکل غور نہ کیا جائے۔ سعادت اور عباس کی زندہ دلی ہماری محفلوں کی جان تھی۔ انھوں نے بڑے بڑے غم قہقہوں میں اُڑا دیے۔ دارالاحمر کے زمانے میں انھیں نت نئی شرارتیں سوجھا کرتیں۔ راہ چلتے چلتے رُک جاتے اور کسی مکان کی طرف دیکھنے لگ جاتے ــــ "افریقہ کا طوطا!" راہگیر بھی اس نئے پرندے کو دیکھنے کیلئے رُک جاتے۔ دو ایک بار تو ہم پٹتے پٹتے بچے تاج محل کو دریائے ٹیمز کے کنارے نصب کرنے کے منصوبے کی افواہ تو اس سنجیدگی اور اہتمام سے پھیلائی گئی کہ بہتوں کو یقین آگیا۔ انگریزوں کے اس ناپاک منصوبے سے عاشق علی فوٹو گرافر کے قومی جذبات سخت مشتعل ہوئے اور اس نے اپنی گالیوں سے بکنگھم پیلس تک کی بنیادیں اُکھاڑ پھینکیں۔ لیکن جب اُسے اِس خبر کی اصلیت معلوم ہوئی تو وہ منٹو کو مارنے کے لئے دوڑا اور کئی دن تک اُس سے بول چال بند رہی...... مگر امرتسر میں افواہیں پھیلانے والا دِتی میں محوری طاقتوں

کی اُڑائی ہوئی افواہوں کے توڑ میں مصروف نظر آتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں اُس نے کوئی سوا سو چھوٹے بڑے فیچر اور ڈرامے لکھے۔ جب اُس کا سوالہواں مسوّدہ براڈ کاسٹ ہوا تو اس کی وہی کیفیت تھی جیسے کرکٹ کے ٹیسٹ میچ میں کسی کھلاڑی کی سنچری مکمل ہو جائے وہ اپنی سنچری کو سکور بورڈ پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا میری تصویر آل انڈیا ریڈیو کے رسالوں کے سرورق پر چھپنی چاہیے۔ لیکن تصویر کو رسالے کے اندر صرف چار مربع انچ جگہ ملی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا چوکھٹا تھا: "سعادت حسن منٹو، جن کے سو فیچر اور ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں" — اُس کا جی کھٹا ہو گیا۔ بس بھئی خواجہ —!" ایک ادیب کیا اُن کن سُرے گویّوں اور ہیجڑوں سے بھی گیا گذرا تھا جن کی تصویریں آئے دن "آواز" اور "انڈین لسنر" کے سرورق پر چھپا کرتی تھیں۔ "بس بھئی خواجہ اب بہت لکھ لیا آل انڈیا ریڈیو کے لئے۔"

اُس کی تصویر تو "آواز" کے سرورق پر نہیں چھپی تھی لیکن تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر اُس کی مجروح "انا؟" زخمی فصیل کے سائے میں اُسے ایک اور زخم لگ چکا تھا۔ اُس کا بچہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ اب آل انڈیا ریڈیو کی محکمانہ مصلحتوں نے اُس بچے کو، جو فن کار کے سینے میں

سو رہا تھا، ایک اور کھلونے سے محروم کر دیا تھا جس سے وہ اپنا دل بہلانا چاہتا تھا۔ منصف صاحب کا کھلنڈرا لڑکا اب بھی پتنگ اُڑانے کا حق رکھتا تھا۔ لیکن اُس کی ڈور پر لنگر پھینک دیا گیا تھا ــــــ کوچہ وکیلاں سے بھاگ کر وہ بمبئی گیا تھا۔ اب وہ پھر بمبئی کے خواب دیکھنے لگا ــــــ سبزی منڈی دلّی کے قبرستان میں اُس کا بیٹا عارف دفن تھا۔ بمبئی کے "ترقی یافتہ قبرستان" میں عارف کی دادی سو رہی تھیں۔ ایڈیپس (OEDIPUS) کی کہانی ایک لازوال کہانی ہے!

"چلو بمبئی صفیہ ــــــ" وہ اپنی بیوی سے کہتا۔

"تو چلئے نا پھر" صفیہ جواب دیتی۔ "میرا یہاں کون بیٹھا ہے ــــ"

صفیہ کی والدہ، بہن اور بھائی بمبئی میں تھے۔

اُس نے بمبئی کے فلمی حلقوں سے خط و کتابت شروع کی۔ ریڈیو کی بدولت اب وہ لوگ بھی اُس کے نام سے متعارف ہو چکے تھے جو ناخواندہ تھے اور جو "ہتک، خوشیا، بو، نیا قانون، نعرہ اور دھواں" کے مصنّف کو نہیں جانتے تھے۔ منٹو کا نام ہی کچھ ایسا نرالا تھا کہ آدمی سُن کر چونک پڑتا۔ 'آواز کی دنیا میں' اُس کی وہی اہمیت تھی جو چارلی چپلن کی فلمی دنیا میں۔ چپلن کی طرح منٹو کی انفرادیت بھی اپنا نقش چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

ریڈیو والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ رُک جائے۔ اُس سے مزید ترقی کا وعدہ کیا گیا لیکن اُس کی طبیعت اُچاٹ ہو چکی تھی۔ پطرس جیسے روشن خیال آدمی کو بھی "جرنلسٹ" کے ہنگامے میں "رائے عامہ" کے سامنے جھکنا پڑا تھا اور اِس ڈرامہ کی نشر ثانی ممنوع قرار دی گئی تھی۔

وہ اُداس رہنے لگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً اُداس تھا۔ اُس کی اُداسی ہر اُس آدمی کی اُداسی تھی جو زیادہ سوچتا ہے۔ اُس کے قہقہوں میں بھی مجھے ہمیشہ اُس بچے کے بلکنے کی آواز سنائی دیتی تھی جس سے کوئی محبت نہیں کرتا اور جو گھر کے کسی کونے میں بیٹھا اپنے ساتھیوں سے دور، جو اُس سے کھیلنا نہیں چاہتے اپنے خیالات میں مگن رہتا ہے اور کاغذ کے ٹکڑوں، کپڑے کی دھجیوں، ریت، مٹی، پانی سے اپنے کھلونے بناتا بگاڑتا ہے۔ کبھی وہ باپ کی شبیہ بناتا ہے اور اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالتا ہے، کبھی بڑے بھائی کا بُت تراشتا اور اُس کی ناک اُڑا دیتا ہے اور کبھی ماں کی مورتی بناتا ہے اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیتا ہے — بھادوں کی بارش کی طرح کہ بوندیں بھی ہیں اور دھوپ بھی! بلکتے بچے کو گدگدا دیجئے تو وہ ہنسنے لگا بھی اور ہچکیاں بھی لے گا — منٹو کے قہقہے بھی اشک آلود ہوتے تھے۔ لیکن اُس کے زندہ ہوتے گلے کی آواز ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ رحم و ترحم کے جذبات سے اُسے نفرت تھی۔ چنانچہ اُس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ اپنے روحانی اور جسمانی درد کو چپ چاپ برداشت

کیے۔ اُس کا دل غم کھانے میں بودا نہیں تھا۔ مگر آخر دل تھا۔ اور آخر کار یہ عمارت ڈھے کر ہی رہی۔ اُس کے سوانح نگار کو، جو اُس کا دوست بھی ہے۔ اس سانحہ نگاری سے دکھ ہوتا ہے۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب اُس کے سینے کا درد ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ یہ دلی کا ذکر ہے۔ جرمن اور آسٹرین اطبا کا وہ بہت قائل تھا۔ پتہ چلا کہ سندھیا ہاؤس میں کوئی آسٹرین ڈاکٹر پریکٹس کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ چمک اُٹھا — "لے بھئی خواجہ۔ بن گیا کام۔ لگائے گا کوئی REICHSTAG PLASTER —

ڈاکٹر نے ایکس رے کرنے سے پہلے اُس کی "MEINKAMF" پوچھی اور اسٹیتھیسکوپ سے معائنہ کرتے وقت دس تک کی گنتی سنی۔ آواز سینے کے اندر سے آنی چاہیے تھی گونجتی ہوئی تاکہ پھیپھڑوں کی صحیح کیفیت معلوم ہو سکے — آواز گونجنی چاہیے تھی! یہ اُسے پہلی بار معلوم ہوا۔ دیسی ڈاکٹر تو منہ سے گنتی کراتے تھے۔ اس تجربہ کا کئی دن تذکرہ رہا۔ بس صاحب ڈاکٹر جرمن یا آسٹرین۔ باقی سب کمپاؤنڈر۔"

ایکس رے دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے اُس کے درد کو پرانی "پلیورسی" سے منسوب کیا۔ میں نے التزاماً شراب کا ذکر کیا۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا ایک آدھ پیگ سے کوئی مضائقہ نہیں۔ منٹو نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ "کیوں خواجہ — اب بنا!"

خوردنی ادویات کے علاوہ کافور کا تیل ملنے کے لئے دیا گیا۔ ہدایت تھی

کہ تیل خوب زور سے ملا جائے۔ جسم گرم ہو جائے اور تیل جذب۔ یہ کام صفیہ کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس لئے میرے سپرد ہوا۔ کافور کی بُو سے اُسے ہمیشہ مردے یاد آجاتے ـــــ عارف، اُس کا بچہ! ـ "ہٹاؤ یار مجھے نہیں چاہیے ایسا علاج۔ میں کوئی میت نہیں ہوں۔" "لیکن درد؟" ـ "ہونے دو" ـــ پہلی شیشی ختم ہونے کے بعد یہ تیل پھر کبھی نہ آیا۔ درد ہوتا تو ہونٹ کاٹ لیتا اور ٹانگیں سینے سے لگائے پڑا رہتا۔ رات کو کھانے سے پہلے ایک ڈیڑھ پیگ وہسکی پی لیتا۔ لیکن جب اُسے کام کرنا ہوتا تو بوتل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

اُس کا دلّی کا زمانہ بڑے اعتدال کا زمانہ تھا۔ ملازمت کی تگ و دو سے دو تین ماہ قبل اور نوکری ملنے کے دو تین ماہ بعد تک میں اُسی کے یہاں مقیم تھا۔ کچھ عرصہ رشید بلڈنگ میں رہا۔ یہ بھی اُس کے گھر کے قریب ہی تھی۔ جب حسن بلڈنگ میں ۱۸ نمبر کا فلیٹ خالی ہُوا تو میں وہاں اُٹھ آیا۔ یہ فلیٹ سعادت کے فلیٹ کے عین اُوپر تھا۔ کرسی رکھ کے ہم نمبر ۱۸ کے صحن میں دیکھ سکتے تھے...... یوں ہمارا وقت اکٹھے ہی گذرتا تھا۔

اُس کی گھریلو زندگی قابلِ رشک تھی۔ امن و آشتی اور باہمی سمجھوتے کی ایسی فضا کم ہی گھروں میں ہوگی۔ یہ نہیں کہ میاں بیوی میں کبھی "تُو تُو" نہیں ہوتی ـــ ہوتی تھی اور اکثر ہوتی تھی۔ لیکن وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ وہ "صفیہ" تھی اور وہ "سعادت صاحب"۔ اُن کی "تُو تُو" اُن کی چاہت کے لئے چاٹ کا کام دیتی تھی۔

چاٹ کا سعادت کو بہت شوق تھا۔ اُس کے جاننے والوں میں سے بہتوں نے اُسے ٹماٹر، مرچیں، پیاز اور مسالہ کا کچومر بناتے دیکھا ہوگا۔ اُسے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ میاں بیوی کا یہ سمجھوتہ تھا کہ کپڑے بیوی دھوئیگی۔ استری میاں کرے گا۔ اُس کے دستر خوان پر ہمیشہ دو تین قسم کے سالن ہوتے تھے۔ لیکن وہ کھانا اِس تیزی سے کھاتا تھا جیسے چبا نہیں رہا، نگل رہا ہے۔ گاڑی چھوٹی جا رہی ہے۔ پکوڑوں اور قیمہ بھرے سموسوں سے اُسے خاص رغبت تھی۔ دلّی میں نمائش لگی تھی۔ یہاں اُسے صرف دو چیزیں پسند آئیں۔ ایک تو "گرما گرم چوڑیاں"۔ کانچ کی چوڑیاں جو اُس کے سامنے بھٹی سے نکل رہی تھیں اُس کے لئے اسی حیرت کا باعث تھیں جو کسی بچے کی آنکھوں میں پہلی بار ریل یا ہوائی جہاز کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اُس نے صفیہ کے لئے درجنوں چوڑیاں خریدیں۔ دوسری چیز جو اُسے پسند آئی وہ WAFER بنانے کی مشین تھی۔ اِس مشین کو اُس نے پھلفلے بنانے کی مشین کا نام دیا۔ WAFERS کے لئے "پھلفلوں" سے بہتر نام مجھے آج تک نہیں سوجھا۔

گھر کے لئے سودا سلف لانے میں اُس نے کبھی توہین محسوس نہیں کی تھی۔ تنخواہ ملنے پر میاں بیوی تانگہ لیتے اور کھاری باؤلی کا رُخ کرتے اور مہینہ بھر کا سودا لے آتے۔ بعد میں ایک سکھ دوکاندار مل گیا۔ اس کا سٹور چاندنی چوک کے گوردوارہ کی دوکانوں میں واقع تھا۔ اس کے یہاں ہر سودا نہایت صفائی ستھرائی

سے بندھا ہوا ملتا۔ اور جوں جوں جنس مطلوب ہوتی وہ اپنی سائیکل ٹرالی میں گھروں پر بھیج دیتا۔ گھنٹہ گھر کی مٹھائی، لکھنؤ کا روغن چنبیلی، بلیماران کی چوڑیاں اور جوتیاں میسور کی ساڑھیاں...... اُس کے بجٹ میں ہر چیز کی گنجائش نکل آتی۔ خالی خولی تنخواہ پر اُس کا گذارہ ناممکن تھا۔ ریڈیو کے لئے ڈرامے اور فیچر لکھنے کے ساتھ ساتھ وہ رسائل کے لئے افسانے پبلشروں کے لئے کتابیں اور فلموں کے لئے کہانیاں بھی لکھ رہا تھا۔ "بنجارا" نام کی ایک فلمی کہانی اُس نے دلی کے سیٹھ جگت نارائن کے لئے لکھی۔ خدا معلوم اس کا بعد میں کیا حشر ہوا۔ اس کے گانوں کے لئے اس نے احمد ندیم قاسمی کو بلوایا۔ قاسمی اُن دنوں محکمہ آبکاری پنجاب میں ناجائز کشید کی بھٹیاں گن رہا تھا اور اپنے ماحول سے تنگ تھا۔ اُس کے گیتوں میں منٹو کو لوک گیتوں کی دُھن سنائی دی تھی۔ "لہنگے کی لہروں کے تلے۔ ماکھن سے پاؤں رقص میں" شاید ان گیتوں میں بھی کسی "بیگو" یا "وزیر" کی آواز گونج رہی تھی —— کسی الھڑ چرواہی کا الھڑ نغمہ۔

دلی کے پبلشروں میں، ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے کی شرافت نے اُس کا دل موہ لیا۔ وہ مستقلاً ساقی کے لئے لکھتا رہا اور شاہد احمد دہلوی نے اُس کے دو مجموعے خریدے —— "دھواں" اور "جنازے"۔ منٹو نے مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اِن کتابوں کے جملہ حقوق ساقی بُک ڈپو کے نام محفوظ ہو گئے۔ لیکن منٹو کی موت کی خبر سن کر مولوی نذیر احمد کا پوتا، شاہد احمد دہلوی، کراچی سے لاہور

آیا اور دونوں کتابیں یہ کہہ کر منٹو کی بیوی کو واپس کر دیں کہ اور تو میرے پاس کچھ نہیں یہ کتابیں حاضر ہیں ـــــ دلّی کا دِل لٹنے کے بعد بھی غنی ہی رہا۔ خدا معلوم پنجاب کے پبلشر کیا سوچ رہے ہیں؟

مسجد کے زیر سایہ

بجھتے دیے کالی روشنیاں

جب میں کسی موٹر کی ٹیل لائیٹ دیکھتا ہوں تو مجھے "ہتک" یاد آجاتی ہے اور منٹو کے کاغذی پیراہنوں میں ملبوس وہ تمام "سوگندھیاں" چہرا ہے پر صف بستہ فریاد کناں نظر آتی ہیں جن کی نسوانیت کی "ابد آباد" سے توہین ہوتی چلی آئی ہے!

اور جب میں کوئی "ہریکین لالٹین" دیکھتا ہوں تو مجھے وہ "مہم" یاد آجاتی ہے جس کی تفصیل منٹو کی کہانیوں کا پس منظر سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

شاید سنہ ۴۲ء کی بات ہے —— "شاید" یوں کہ تاریخوں کے معاملے میں میرا حافظہ کچھ ایسا قابلِ اعتبار نہیں۔ جس شخص کی زندگی مسلسل ناکامیوں کی جنتری ہو، اُس کا ذہن یہی کوشش کرے گا کہ یہ تلخ یادیں جلد از جلد محو ہو جائیں۔ زخمی فصیل کے سائے میں بچے کی موت کا جو گھاؤ میرے سینے پر لگا تھا، اُس زمانے کی بہت سی

یادوں کو شل کر گیا۔ بمبئی جاکر، منٹو کے پھر دلّی آنے کی تاریخ بھی انہی یادوں میں سے ہے۔ تاہم اس مہم کی یاد جس میں حسن عباس، منٹو اور میں، تینوں شریک تھے، ہریکین لالٹین کی روشنی میں ہمیشہ اُجاگر ہو جاتی ہے۔ منٹو، اِس مرتبہ بھی، اپنی کسی کہانی کے مقدمہ کے سلسلہ میں آیا تھا ــــ میں اخلاقِ عامہ کے محافظوں کا احسانمند ہوں جو کسی بہانے دوستوں کی ملاقات کا بندوبست کر ہی دیتے تھے۔ سچ کہتے ہیں بعض اوقات "شر" سے بھی "نیکی" کی صورت نکل آتی ہے۔ اللہ ان لوگوں کو جزائے خیر دے!

سعادت کوئی سال ڈیڑھ کے بعد آیا تھا۔ وقت کم تھا، کام زیادہ۔ لیکن اس کی آمد بن منائے کیوں کر جا سکتی تھی۔ میری اور حسن عباس کی بیویاں، دونو مولوی واقع ہوئی تھیں۔ امرتسر دُور تھا۔ دار الاحمر مقفل۔ باری صاحب نہ جانے کس دنیا کی رصدگاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سعادت کی طبیعت مقامہ کی وجہ سے مکدر بھی اور بیئر کم یاب۔ لیکن عباس کو سپنسر کے یہاں کے سبھی بیرے جانتے تھے۔ ہم نے ریلوے سٹیشن کا رُخ کیا۔ مگر ریفرشمنٹ روم میں سعادت کی طبیعت مکدر سے منغض ہو گئی ــــ اجنبی آوازیں، گاڑیوں کا شور، کھوپرے کے تیل کا دھوآں، پیاز کی بُو، سانسوں کا تعفن ــــ دم گھٹنے لگا۔ سعادت نے کہا "کہیں" چلنا چاہیئے۔ "کہیں"۔ وہ بھانپ گیا کہ میں کیا سوچ رہا تھا اور میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی مجھے معلوم تھا کہ آج چھٹکارا مشکل ہے۔ میں نے کہا ہاتھ چھوڑ دو

میں بھاگوں گا نہیں۔ اُس نے نعرہ لگایا۔ "خواجہ ابوسعید قریشی زندہ باد۔" پھر وہ عباس سے مخاطب ہوا: "ہاں بھئی قلعۂ معلّیٰ کے گائیڈ! چل کہاں چلتا ہے۔"

"فتح پوری!" عباس نے تانگے والے کو پتہ دیا۔ "بھئی کمال گھوڑی ہے چال دکھانا ذرا اس کی۔"

تانگے والا تاڑ گیا کہ بابو مزے میں ہیں۔ گھوڑی کے گھنگھرو کسی رقاصہ کی پازیبوں کی طرح بجنے لگے۔ تانگہ فتح پوری مسجد کے سائے میں، شاہ جہانپوری ہوٹل کے سامنے رُکا۔

"لعنت ہے تجھ پر خواجہ حسن عباس بی۔ اے۔ اب بیئر سے بھی نشہ ہونے لگا۔"

"نشہ کس کافر کو ہے۔" عباس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے عشا کی جماعت کا پتہ نہیں پوچھا تھا۔ فتح پوری مسجد کا راستہ مجھے بھی معلوم تھا۔" منٹو نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ بمبئی جا کر تیرا دماغ شاید روشن ہوگیا ہوگا۔" عباس نے پان کی گلوری کلّے میں دباتے ہوئے کہا۔ "لیکن یوں لگتا ہے کہ تو پہلے سے بھی زیادہ گھامڑ ہو گیا ہے۔ ہاتھ اُٹھا خواجہ ابوسعید فاتحہ کے لئے۔ اللہ بخشے سعادت حسن منٹو بہت بڑا افسانہ نگار تھا۔ خدا بخشے بہت بڑا فراڈ سمجھتا تھا خود کو۔ بمبئی میں انتقال ہو گیا بے چارے کا ——— تجھ جیسے تماشبینوں کے جرم ہائے سیاہ کو مسجد کے سائے کے سوا اور کہاں پناہ مل سکتی۔ اللہ تیرے گناہ معاف کرے خواجہ سعادت حسن منٹو

—— ہاتھ اُٹھا بھئی خواجہ .....“

عباس نے سچ کہا تھا۔ پرانی چاوڑی کہاں تھی؟ جامع مسجد کے سائے میں۔ ہیرا منڈی؟ مسجد عالمگیری کے سائے میں۔ داغ کی حجاب کہاں رہتی تھی؟ مسجدِ ناخدا کے سائے میں —— شاہجہانپوری والے کی بغل میں، فتح پوری مسجد کے زیرِ سایہ بھی ایک ایسی ہی گلی تھی۔ ایک اندھی اور اندھیری گلی! عباس اِس گلی کے آخر میں بائیں ہاتھ ایک مکان کے سامنے رُکا۔ مکان کی کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ لگانے سے کھُل گیا۔ لیکن سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہم دیا سلائی جلا کر، رسی کا سہارا لیتے، جو دیوار کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی اُوپر پہنچے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بائیں ہاتھ ایک اور دروازہ تھا۔ لیکن بند۔ اُس کی جھرّیوں سے اندھی روشنی کی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ عباس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی کا نام لے کر آواز دی۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ لیکن کوئی نہ آیا۔

عباس نے کہا:

”جنگ کا زمانہ ہے بھائی NO BERTH WITHOUTRESERVATION

ٹھیرو کوئی دوسرا کمپارٹمنٹ دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات مسافر نہیں بھی آتے“۔

اسی گلی میں ایک اور مکان!

سیڑھیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ مکان گلی کے منبع کے قریب تھا۔ چنانچہ اس کی سیڑھیاں سڑک کی روشنیوں کے باعث قدرے کم تاریک تھیں۔ قلعہ معلیٰ

کے گائیڈ نے کہا: "یہ حبشہ کی شہزادی کی محلسرائے ہے۔" اور اس بے تکلفی سے
اُوپر چڑھ گیا جیسے اس کی تمام غلام گردشوں سے واقف تھا۔ اُوپر کا دروازہ
ادھ کھُلا تھا لیکن اندر سے کچھ "بلیک آؤٹ" قسم کی روشنی آرہی تھی جیسے اس
بستی کے باشندوں کو اچانک ہوائی حملہ کا ڈر ہو۔ "ارے بھئی کوئی ہے؟"
عباس نے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

سامنے، لالٹین کی روشنی میں، ایک عورت ننگے فرش پر بیٹھی روٹی کھا
رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی عمر بمشکل اٹھارہ اُنیس برس
کی ہوگی۔ لیکن وہ فاقہ زدہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔
اُس کی آنکھیں اُس بچے کی طرح ڈری ہوئی تھیں جسے کوئی بُری بات کرتے
ہوئے کسی نے سر سے پکڑ لیا ہو۔

"ارے بھئی کوئی مال وال بھی ہے کہ نہیں؟" عباس نے ٹھیٹ تماشبینوں
کے انداز میں پوچھا۔

"اس وقت تو میں ہی ہوں۔" اُس عورت نے لقمہ نگلتے ہوئے پوربی لہجے
میں جواب دیا۔ اُس نے لالٹین فرش سے اٹھائی اور اسے اپنے چہرے کے
برابر لے آئی جیسے اپنا مال دکھانا چاہتی ہے۔

"اچھا تو پھر کبھی آئیں گے!" عباس نے کہا۔

گاہک کو سودا پسند نہیں آیا تھا۔ اب وہ کوئی دوسری دوکان دیکھنے کا

ارادہ کر چکا تھا۔

لڑکی کا چہرہ دفعتاً اور سیاہ ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہریکین لالٹین، دھواں چھوڑتی ہوئی یکایک بھک سے بجھ گئی اور اُس عورت کے چہرے پر، جو اُس کی روشنی میں اپنا سودا بیچنا چاہتی تھی، کالکھ کا ایک اور لیپ کر گئی ہے۔ سیڑھیاں اُترتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے باہر سڑک کے، فتح پوری کے چاندنی چوک کے، ساری دلی کے دیئے گل ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں، پٹھانوں، تغلقوں، لودھیوں، خلجیوں، غلاموں، مغلوں اور انگریزوں کی دلّی پر کسی بہت بڑے ہوائی حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جس سے بچنے کے لیے ہم کسی اندھے کنوئیں میں اُترتے جا رہے ہیں۔

منٹو خاموش تھا۔ شاید اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی "سوگندھی" میں اب چلنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ ہتک کا احساس بھی جاتا رہا ہے۔ سیٹھ ادنہ کر کے نکل گیا ہے۔ لیکن اُس کی موٹر کی ٹیل لائٹ بھی نہیں جل رہی۔ اگر وہ کسی کو کچل کر بھی نکل جائے تو اُس کا کوئی چالان نہیں کر سکے گا۔

"پان کھائے گا بیٹھو؟" عباس نے گلی کے باہر پنواڑی کی دوکان کے سامنے رکتے ہوئے پوچھا۔ "چونا زیادتی۔ تمباکو پڑے گا۔ قوام لکھنؤ کا۔ ہم کوئی ایسے ویسے تماشبین ہیں —— اور تیرے لئے کیا خواجہ ابوسعید قریشی۔ کوکین کہ جین تان کی گولیاں؟"

پان لینے کے بعد ہمارا گائیڈ اُس سڑک پر ہولیا جو زینت محل کو جاتی تھی۔ مغرب کی طرف ـــ اور کوئی تیس چالیس گز چلنے کے بعد ایک ایسی گلی میں داخل ہوا جس کے سامنے فتح پوری مسجد کی جنوبی دیوار نظر آرہی تھی۔ گلی کے آخری مکانوں کی دیواریں مسجد کی دیوار سے ساجھی تھیں۔ گلی میں قدم رکھتے وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم مسجد کے کسی چور دروازے کی تلاش کر رہے ہیں مو

عباس نے دائیں ہاتھ کے دوسرے مکان کے اُونچے چبوترے کی طرف قدم اُٹھایا لیکن ایک کُتا اُس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ کُتا بھونکا۔ عباس پیچھے ہٹ گیا :

"ہٹاؤ یار، آج کچھ قسمت ہی خراب معلوم ہوتی ہے۔ پھر کبھی ارادہ ہو ادھر کا تو قصائی کے ہاں سے ہوتے آنا۔" آئندہ تماش بینوں کو ایک جیب ہڈی کے لیئے بھی لگوانا ہوگی"۔ کتا پھر بھونکا۔ عباس نے کہا۔

"یاشیخ ! یاشیخ ! ارے او لیلیٰ کے کُتے۔ ہم کو بھی نہیں پہچانتا ـــ"

کتے کی آواز سن کر گھر والے چوکنے ہوگئے۔ اُوپر سے کسی نے آواز دی کہ دوسرے دروازے سے آجایئے ـــ

"بھئی زندہ باد" عباس نے مکان والوں کی دُور اندیشی کی داد دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کیسے کیسے انتظام کر رکھے ہیں۔ شرفا کے لیئے۔ ادھر سے آؤ اور ادھر سے نکل جاؤ۔ دونوں دروازے بند ہوں تو مسجد کی دیوار پر چڑھ جاؤ۔ لوگ سمجھیں

کہ فرشتہ اُتر آیا کوئی فلک مشتری سے ۔۔۔ "دیکھا خواجہ سعادت حسن منٹو؟ بڑا آیا "ہتک" کا مصنف! سائیسی علم دریا ہے پیارے۔"

مکان سے اُس اصطبل کی بُو آ رہی تھی جہاں بیمار گھوڑیاں بندھی ہوں۔ سامنے گھڑا تھا جہاں ایک لوٹا پڑا سڑا تھا۔ اس کے پاس ہی سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک چولہا اپنا سیاہ منہ کھولے پڑا تھا۔

دوسری کوٹھری میں ایک شیشوں لگا پلنگ تھا، جیسے ماں باپ اکثر اپنی بیٹیوں کے جہیز میں دیتے ہیں۔ پلنگ پر ایک میلا سا بستر تھا جس کی چادر اُس بڑھیا کے لاکھا لگے چہرے کی طرح شکن آلود تھی جس نے ہمیں اپنا گاہک سمجھ کر اُوپر بلایا تھا۔ اُس کے تصور سے مجھے اُن پرانی عمارتوں کا دھیان آتا ہے۔ جن کے پلستر میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ لیکن جب کسی کی سواری اُدھر سے گذرنا ہوتی ہے تو اُن کے ماتھوں پہ سرخی اور سفیدی کا لیپ کر دیتے ہیں۔ اُس کمرے کی فضا ہسپتال کے اُس کمرے کی طرح متعفن تھی جس میں پوسٹ مارٹم کے لئے لاوارث لاشیں رکھی جاتی ہیں ۔ یا وہ میتیں پڑی رہتی ہیں جنھیں اُن کے مفلس عزیز خلق خدا کی بھلائی کے لئے بیچ جاتے ہیں۔ یہی ڈر تھا کہ اگر ہم ایک منٹ بھی وہاں رُکے تو ہمارا معدہ باہر آ جائے گا ہم نے اپنی اُبکائیوں کو سگرٹ کے دھوئیں سے بہلایا اور سانس روک کر وہاں سے بھاگ نکلے۔

جس وقت ہم گلی سے نکل رہے تھے، فتح پوری مسجد سے اذان کی

آواز آ رہی تھی۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ مسجد کے سائے میں ان مکانوں کا کرایہ کون وصول کرتا ہوگا۔

ہماری مہم ابھی جاری تھی۔ عباس بدستور چہک رہا تھا۔

"یار مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ ساری خوش شکل لڑکیاں WACS ہو گئی ہیں۔ پیشہ وروں میں جو کام کی تھیں انھیں امریکی لے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم تو بھی امریکی ہو جا خواجہ سعادت حسن منٹو۔"

"بکواس نہیں کر زیادہ۔ یہ بتا اب کدھر چلنا ہے ــــ سگرٹ پلا خواجہ سعید۔ طبیعت منغض ہو گئی خدا کی قسم۔"

"منغض؟ آج میں تیری طبیعت صاف کر کے رہوں گا خواجہ سعادت حسن منٹو ابھی دیتا ہوں تار صفیہ کو۔" عباس نے کہا۔

"چل چل بک بک نہیں کر زیادہ......"

فتح پوری سے نکل کر ہم اُن ہوٹلوں کے سامنے رکے جو کلاتھ مارکیٹ کے شمال میں ریلوے سٹیشن کے گوداموں کی طرف واقع تھے۔ ہوٹل کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس کا زینہ نہایت کشادہ تھا تین آدمی دوش بدوش چل سکتے تھے۔ دیواروں کے ساتھ پھولوں والی روغنی اینٹیں چمک رہی تھیں۔ پہلی منزل پر منیجر کا کاؤنٹر تھا۔ کاؤنٹر پر ٹیلیفون اور بیروں کو بلانے کی گھنٹی۔ عباس نے منیجر سے کسی خاص بیرے کو پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ منیجر سمجھ گیا۔ "ابھی آتا ہے۔ آپ ذرا سامنے کے کمرے

میں تشریف رکھئے۔"

کمرہ گرد سے اٹا ہوا تھا جیسے استعمال نہیں ہوتا۔ لوہے کا ایک نواڑی پلنگ تھا۔ ننگا جیسے کسی زخمی مریض کی چادر اُتار لی جائے اور اُس کی پٹیاں برہنہ ہو جائیں۔ بیرے نے کہا "بیٹھ جائیے میں ابھی آتا ہوں۔" مگر ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ہم نے پلنگ کو چھوا تو وہ چیخ اُٹھے گا اور اس کے زخموں سے پیپ بہنے لگے گی۔

کمرے کی فضا گرد کے ذرّات سے بوجھل تھی جیسے وہاں کبھی ہوا کا گذر نہیں ہوا۔ ہمارا سانس گھٹ رہا تھا۔ ہم کوئی دس منٹ تک سگرٹ کے دھوئیں سے اس ساکت فضا میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن دھوئیں کی لہریں پرانے کپڑوں اور جالے کے پردوں کی طرح کمرے کی غیر مرئی کھونٹیوں سے لٹکتی جا رہی تھیں۔ بغیر شیڈ کا بلب ہمارے سروں پر کسی لاوارث لاش کی طرح لٹک رہا تھا۔

ہر بار جب کوریڈر میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی تو ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔

"یہ انتظار کا[1] تیسرا رُخ ہے خواجہ" میں نے کہا۔

"لعنت ہو اس انتظار پر اور لعنت ہو ہم پر" منٹو نے جل کر جواب دیا۔

---

[1] "انتظار" اور "انتظار کا دوسرا رُخ" سعادت کے دو ڈرامے تھے جو بے حد مقبول ہو چکے تھے۔

"ہم پر کیوں لعنت ہو خواجہ۔" عباس نے فوراً اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "لعنت ہو تماش بینوں پر۔"

دروازہ کھلا اور بیرا اندر داخل ہوا۔

"ابھی آ رہی ہے جناب۔" اس نے نہایت رازدارانہ انداز میں کہا۔

"مال گاڑی سے آئے گی؟" عباس نے کہا۔ "بمبئی سے آیا ہے سیٹھ۔ کیا کہے گا کہ دلّی میں چھوکری نہیں ملتا۔"

"اب کیا عرض کروں جناب۔ جنگ سالی نے سارا دھندا چوپٹ کر دیا ہے ہم لوگوں کا۔ ویسی صاحب لوگوں کے ساتھ تو جاتی ہی نہیں۔ بارکوں میں پہنچتی ہیں ماں قسم۔ گھنٹے ڈیڑھ میں سو پچاس ڈال لاتی ہیں چولی میں۔ عیش کرتی ہیں سالیاں۔ بات نہیں کرتیں کسی سے سیدھے منہ۔ کہتی ہیں کالا لوگ اٹھنّی چونّی کی خاطر جھگڑتا ہے ۔۔۔"

"چھوڑ یار۔ لعنت بھیج ۔۔۔ آؤ چلیں۔" سعادت بالکل کباب ہو چکا تھا۔

"نہیں جناب۔ ابھی آ رہی ہے۔" بیرے نے کہا۔ "بس دو منٹ میں۔ کھانا کھا رہی تھی۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔ بازو کے کمرے میں۔"

بازو کے کمرے کی دیوار لکڑی کی تھی۔ اُس کی جھرّیوں سے ہم نے دیکھا کہ ایک موٹا سا مرد کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پہ کھانا رکھا ہے اور میز کی دوسری طرف کوئی تیس پینتیس سال کی ایک فربہ اندام عورت بیٹھی تیزی سے

نوالے نگل رہی ہے۔ گویا اُسے اندیشہ ہے کہ اگر اس نے اطمینان سے کھانا کھایا تو اُس کا کوئی گاہک نکل جائے گا۔ اُسے کھانے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے جسم فروشی کی طرح یہ بھی ایک فرض تھا جو اُس پر عاید کر دیا گیا تھا۔

"یار ہم کس قدر ذلیل ہیں۔" اگر ہم نے بھی یہی حرکت کہیں دس منٹ پہلے کی ہوتی تو شاید ہمیں کچھ اور ہی منظر نظر آتا۔

"ذلیل نہیں، ذلیل الدھر خواجہ سعادت حسن منٹو۔"

"لعنت ہے ہم پر —— آؤ اب چلیں۔"

اس مہم کی روشنی میں اگر آپ منٹو کے تماش بینوں سے ملیں تو شاید آپ کو انھیں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اُن کے ضمیر زندہ ہیں۔ لیکن اُن سے آپ کا تعارف بعد میں ہوگا —— اس سرگزشت کے بعد جو میں نے آپ کو سنائی ہے آپ جان گئے ہوں گے کہ منٹو اپنے کردار کہاں سے لاتا ہے۔

منٹو کی حقیقت نگاری خالی خولی تصوّر کا کرشمہ نہیں۔ وہ اِس نوع کی مہمات سے جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، اپنے کردار اور ڈرامائی افسانوں کے سٹیج کے لئے "سین سینریاں" اکٹھی کرتا رہتا تھا اور کسی چابکدست پروڈیوسر کی طرح انھیں اس سلیقے سے سجاتا تھا کہ تماشائی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے تھے۔

کشوری کو کھولی میں بٹھا کر وہ چالی کی تینوں منزلوں میں اپنی بیٹی کی تلاش کر چکی تھی۔

سنڈاس کے پاس جاکر بھی اُس نے آواز دی مگراب اُسے سیخِپ کی شکایت بھی نہیں تھی۔اور وہ باہر اُس نکڑ پر جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا تھا چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ...... وہ گھورے کی طرف بڑھی۔اور جب سیمنٹ کی بنی ہوئی موتری کے پاس آئی تو سرپتا اُٹھ کھڑی ہوئی ...... وہ گلی کے کالے کٹ پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی بنگی لکیریں نہ کھینچی گئیں تو آمد و رفت بند ہو جائے گی۔"

(دس روپے کا نوٹ)

"کمرہ بہت چھوٹا تھا..... تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے۔جن کے اُوپر ایک خارش زدہ کُتّا سو رہا تھا۔اس کے بال اُڑے ہوئے تھے۔اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے کا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے.....

پاس ہی ایک کھونٹی کے ساتھ طوطے کا پنجرہ

لٹک رہا تھا۔ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے

سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا......

گراموفون کی زنگ آلود سوئیاں تپائی کے

علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔

اس تپائی کے عین اُوپر دیوار پہ چار فریم لٹک رہے

تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی

تھیں۔" (ہتک)

"اُسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے

جن میں عام طور پہ لوہے کی دو چار پائیاں اس

طور پہ بچھی ہوتیں گویا اُن پہ جی بھر کے سونے

کی اجازت نہیں ہے۔" (دس روپے کا نوٹ)

"ایک تنگ گلی ہے۔ دو بلڈنگوں کے

درمیان۔ دونوں طرف دروازے ہیں تاکہ لوگ

اندر داخل ہو کر پیشاب پاخانہ نہ کریں، پھر بھی

دونوں بلڈنگوں کی کھڑکیوں میں سے پھینکا ہوا

کچرا کافی جمع ہو جاتا ہے۔" (پڑھیئے کلمہ)

"کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس

ٹھہر گیا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے

بورڈ پر 'میرا نیا ہوٹل' لکھا تھا۔ مگر عمارت نہایت

غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سود خور پٹھان

بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے

...... کریم نے ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا

جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور

ایک تپائی پڑی تھی ...... وہ لوہے کے

پلنگ پر بیٹھ گئی۔" (شاردا)

"فرش پر غلاظت بلبلے بن بن کر پھٹ

رہی تھی۔ دیواروں پر اعضائے ...... کی

مہیب تصویریں بنی تھیں۔

فرش پر کیڑے چل رہے تھے۔ دیواروں پر

انسان کے شرمناک حصوں کی نقاشی کے لئے اب

کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی ......" (موزی)

وہ بائی کلہ سٹیشن کے پاس ایک نہایت ہی

واہیات جگہ میں رہتی تھی۔ جہاں کوڑے کرکٹ

کے ڈھیر تھے۔ آس پاس کا تمام فضلہ تھا۔
کارپوریشن نے یہاں غریبوں کے لئے جست
کے بے شمار جھونپڑے بنادیئے تھے.....
ٹاٹ کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے پردے
کے پیچھے مجھے دو بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔"

(سراج)

"جگہ جگہ اکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے
پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے
......چونہ اور سیمنٹ...... جابجا بجری بکھری
پڑی تھی......
ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش
پر ایک عورت لیٹی ہے۔ کمرے میں دو تین
برتن ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

(سو کینڈل پاور کا بلب)

کتنی سڑاندھ ہے، کتنا تعفن ہے، کتنی گندگی ہے — لیکن یہ ساری غلاظت
یہ ساری عفونت ہمارے آپ کے دم قدم سے ہے۔ یہ لوہے کے پلنگ جن

اُس اٹھتر بیسواء "سریتا" کو جی بھر کے سونے کی اجازت نہیں، اُن سیٹھوں کی سرپرستی کے مرہونِ منت ہیں جو بڑی بڑی موٹروں میں آتے ہیں اور دس بیس یا سو روپے کے عوض حوا کی بیٹیوں کا جسم خریدتے ہیں۔ وہ جنسی جھونپڑے جن کے دروازوں پر پھٹے ہوئے ٹاٹ لٹکتے ہیں، جن کے پیچھے بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں والی سماج کا بسیرا ہے کار پوریشن کے بنوائے ہوئے ہیں۔ وہ کھولیاں اور چالیاں جہاں سوگندھیاں بستی ہیں اُن لوگوں کی آباد کردہ ہیں جو معاشرے کی فلاح و بہبود کا دم بھرتے ہیں، سیاسی پنڈالوں پر تقریریں کرتے ہیں، ممبروں سے وعظ جھاڑتے ہیں اور مسجدوں کے زیر سایہ چکلے بناتے ہیں۔ وہ "لائسنس" کی عینی کو تانگہ چلانے کی اجازت نہیں دیتے، پیشہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور جسم بیچنے کا پرمٹ عطا کرتے ہیں۔

میں نے پرانے تماش بینوں سے سنا ہے کہ رنڈی کبھی کبھار "آتی ہے"۔ اُسے اس لذت کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہوتا جس کی جستجو میں لوگ اس کے یہاں جاتے ہیں۔ اُس کی زندگی میں وہ لرزہ خیز ساعت شاذ ہی آتی ہے جسے بیان کرنے کے لئے شاعر اپنا تمام زورِ کلام خرچ کر دیتے ہیں۔ اُس کی زندگی ایک اُکتا دینے والی کہانی ہے۔ وہ جسم بیچ کر جسم کو زندہ رکھنے کے لئے روٹی کماتی ہے۔ ہمارے اقتصادی نظام پر اس سے بڑی طنز اور کیا ہو سکتی ہے۔ دن کام کے لئے ہے اور رات آرام کے لئے۔ لیکن وہ رات کو جاگتی ہے۔ نیند کو خدا کی نعمت کہا جاتا ہے۔ لیکن اُس

کی قسمت میں گیلے بنچ ہیں، ٹھنڈی ریت یا ہوٹل کے گرد آلود کمروں کے آہنی پلنگ بلکہ یہیں بار بار اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ رنڈی بھی انسان ہے۔ لیکن ہم اسے صرف ایک مشین سمجھتے ہیں۔ اور ہمارے بے روح معاشرہ نے اُسے سچ مچ ایک مشین بنا دیا ہے اور مشین کو ہر حالت میں اپنا کام کرنا ہے۔

"دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کے

دو بجے یہ کون آیا تھا؟ دروازہ جب زور

سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی....

"دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر

پر سے اُٹھ بیٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا

تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر وہ

غٹا غٹ پی گئی......

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک

گیا تھا کہنے لگا: "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ

کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟.....یوں

ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے

کھپانا پڑیں تو میں دھندا کر چکا — اب تو میرا

منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر
وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر لگا اور چل
میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا
انتظار کر رہے ہیں......

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا
اور بام کی شیشی اُٹھا کر اُس کا ڈھکنا کھولتے
ہوئے کہا۔" رام لال آج میرا جی اچھا
نہیں......."

سوگندھی کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا ہے۔ اُسے نیند کی ضرورت ہے لیکن گھر آیا گاہک لوٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ سودا بیچنے سے انکار کرے گی تو بھوکی مر جائے گی۔ تو وہ چاہتی ہے کہ سیٹھ اندر ہی آ جائے۔ لیکن سیٹھ عزّت دار آدمی ہے۔ رام لال کہتا ہے۔" وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑے کرتے بھی گھبراتے تھے تو کپڑے ویڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل۔"

"ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔
سوگندھی اِس حالت میں جبکہ اُس کے سر میں
شدت کا درد تھا، کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اُسے
روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اُس کے ساتھ والی

کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی، جس
کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اِس عورت
کو اپنی جوان بیٹی کے ساتھ اپنے وطن جانا تھا
لیکن اُس کے پاس کرایہ نہیں تھا۔ سوگندھی نے
کل ہی اُس سے کہا تھا۔ میں تیرے جانے کا
بندوبست کر دوں گی۔"

چنانچہ وہ رات کے دو بجے، صرف ساڑھے سات روپے کی خاطر، درد سر کی شدت کے باوجود باہر جانے پر رضامند ہو گئی —— سوگندھی، ایک بیسوا، عصمت فروش فاحشہ کے سینے میں منٹو انسانیت کی وہ جھلک دیکھ لیتا ہے جسے ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ منٹو اپنے افسانوں میں جگہ جگہ انسانیت کے کھنڈروں سے وہ نوادر کھود نکالتا ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتے ہیں۔ اُس کا آدم جہنم کی گہرائیوں میں بھی جنت نشان ہے —— لیکن سیٹھ سوگندھی کو نہیں قبولتا اور اس کی موٹر کی ٹیل لائیٹ اپنے مالک کی طرح "اونہہ! اونہہ!" کرتی ہوئی اندھیروں میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہ لال انگارہ اُس کی نسوانیت کا مذاق اُڑا کر اُڑ جاتا ہے۔ رام لال دلّال کہتا ہے "پسند نہیں کیا تجھے اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت میں برباد کیے"۔ اُسے اپنے وقت کی بربادی اور کمیشن کے نقصان کا افسوس ہے۔ لیکن وہ جس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا، وہ جو سونا چاہتی تھی لیکن جسے سونے نہیں دیا گیا، وہ جس کے دھندے نے

اُسے دس سال سے بیگار رکھا ہے۔ وہ جس کی نیندیں بھی چھین لی گئی ہیں —
اس کا کسی کو دھیان نہیں — پولیس کبھی تھرڈ ڈگری میتھڈ تہ استعمال کرتی ہے
اور قیدیوں سے راز اگلوانے کے لئے انھیں منجملہ دوسری سزاؤں کے، سونے
نہیں دیتی تو اخباروں میں کہرام مچ جاتا ہے، جگہ جگہ اس کے چرچے ہوتے
ہیں اور عدالتوں کے نقارے گونج اُٹھتے ہیں۔ لیکن جن کی عمریں جاگتے گذر
جاتی ہیں۔ اُن کی نیندیں سلب کرنے والوں کے خلاف کوئی انصاف کو نہیں
پکارتا۔ وہ عورت جس کے سر پر" سو کینڈل پاور کا بلب" روشن ہے۔ اپنے
دلال سے یہ کہتی سنائی دیتی ہے۔ "کہہ جو دیا مجھے سونے دے.... تو مجھے
مار ڈال، لیکن میں نہیں اُٹھوں گی۔ خدا کے لئے میری حالت پر رحم کر....
گذارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کر مجھے
نیند آئی ہے...." لیکن آخر کار دلال اُسے یہ کہہ کر رضامند کر لیتا ہے۔
"دو گھنٹے میں آجائے گی۔ پھر سو جانا" وہ گاہک کے ساتھ چلی جاتی ہے
لیکن "اُس کی آنکھیں سرخ بوٹی ہو رہی تھیں۔ جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی
ہوں" گاہک اُس سے باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اُسے ڈانٹ دیتی ہے
"تم اپنا کام کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو" گاہک کو اُس سے ہمدردی ہو جاتی
مگر "اُس کو کوئی ہمدرد نہیں چاہیے" وہ چاہتی ہے کہ وہ اپنا کام کرے اور
اُسے جانے دے۔ "میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں۔ جب سے آئی

ہوں جاگ رہی ہوں۔"

وہ سرتاپا ہمدردی بن گیا۔

"سو جاؤ یہیں"۔

"میں یہاں سونے نہیں آئی۔ یہ میرا

گھر نہیں"۔

"تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟"

"اُف ـــــ بکواس بند کرو۔ میرا کوئی گھر

نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔ ورنہ مجھے چھوڑ دو اور

اپنے روپے واپس لے لو۔ اُس...... اس

......" وہ گالی دیتی دیتی رہ گئی۔

مگر اس شخص کو جو اس سے پیشہ کرا رہا ہے، صرف اپنے روپوں سے غرض ہے وہ اس کے لئے روپیہ بنانے کی مشین ہے اور مشین کو آرام کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اُس نے اس کے سر کے اوپر سو کینڈل پاور کا بلب لگا رکھا تھا تاکہ اُس کی تیز روشنی میں اُسے نیند نہ آئے۔ مگر وہ ایک ایسی مشین ہے جو باغی بھی ہو سکتی ہے چنانچہ دوسری رات اُس کا وہی گاہک جس سے اُسے ہمدردی پیدا ہو چکی ہے۔ یہ دیکھنے جاتا ہے کہ اُس کا کیا حال ہے۔

اس نے اندر جھانکا۔ فرش کا جو حصہ اُسے نظر آیا۔

اُس پہ ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی ــــ اُس نے
اُسے غور سے دیکھا ــــ سو رہی تھی۔ منہ پہ دوپٹہ
تھا۔ سینہ سانس کے اُتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا
ــــ وہ ذرا اور آگے بڑھا ــــ اُس کی چیخ
نکل گئی مگر اُس نے فوراً ہی دبالی ــــ اس
عورت سے دور ننگے فرش پہ ایک آدمی پڑا تھا۔
جس کا سر پاش پاش تھا۔ پاس ہی خون آلود
اینٹ تھی ......

اُس عورت نے اس شخص کا سر کچل دیا تھا جس نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ جو اسے سوتی کو اُٹھا کر گاہکوں کے حوالے کر دیتا تھا۔ اور اس خوف سے بے پروا ہو کر کہ اُسے قتل کی پاداش میں پھانسی بھی مل سکتی ہے، نہایت اطمینان کی نیند سو رہی تھی ــــ نیند، موت کی بہن، جو موت کو بھی بھلا دیتی ہے۔ نیند جس کی ابتدا ماں کی لوریوں سے ہوتی ہے ــــ مگر بیسوا کس کس کا سر کچلتی پھرے گی۔ دنیا میں اتنے بھٹے نہیں ہوں گے کہ اینٹوں کی ضروری تعداد مہیا کر سکیں گے۔ اور اگر اینٹوں کا سوال حل بھی ہو جائے تو ہمیں اتنے سر کچلے ہوئے نظر آئیں گے کہ سماں دیدنی ہوگا۔ کیسے کیسے مقدس سر پٹیاں باندھے نظر آئیں گے۔

"سوگینڈل پاور" کی عورت کی طرح سبھی کسبیاں اپنے "پیشے" سے بیزار ہیں۔

وہ بالکل اُس عورت کی طرح کھانا کھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جسے ہم نے دلّی کے ہوٹل میں چھری سے دیکھا تھا۔ اُسے کھانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کھانا بھی شاید گاہک ہی کو خوش کرنے کے لئے کھا رہی تھی۔ وہ کھانا کھا رہی تھی۔ اِس لئے کہ اُسے کھانا تھا۔ ورنہ اُس کی کھانے پینے کی حِسّیں بھی اُس کے جسم کی طرح شل ہو چکی تھیں۔ "سرآج" کو دیکھئے —— اپنے پیشے سے بیزار ہے۔ اُس کا دلّال ڈھونڈو جو چھوکریوں کی ہر نبض سے آشنا ہے، وہ بھی اُس کو سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے۔

"سالی کا مستک پھرے لا ہے —— سمجھ میں نہیں آتا کیسی چھوکری ہے۔ ایک دم رونا شروع کرے گی۔ سالی کی کسی سے نہیں بنتی۔ ہر پسنجر سے لڑتی ہے۔ اپنا مستک ٹھیک کر ورنہ جا جہاں سے آئی ہے —— انگ پر تیرے کپڑا نہیں۔ کھانے کو تیرے پاس ڈیڑھیا نہیں —— مارا ماری اور دھاندلی سے تو میری جان کام نہیں چلے گا۔ پر وہ ایک تخم ہے کسی کی سنتی ہی نہیں۔

سرآج اپنے پیشہ سے بیزار ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ وہ گاہکوں کے ساتھ تو چلی جاتی ہے مگر بقول ڈھونڈو کے "سولہ آنے کنواری ہے۔ سالی کسی کو ہاتھ نہیں

لگانے دیتی...... فارس روڈ میں مڈام کے پاس پہنچی۔ وہاں ایک پسینجر کے کاٹ لیا
......اب پسینجر سالا موج شوق کے لئے آتا ہے۔ مال پانی خرچ کرتا ہے۔
ذرا وبا کے دیکھتا ہے ـــــ بس دھمال مچ جاتی ہے۔ مارا ماری شروع
کر دیتی ہے۔ آدمی شریف ہو تو بھاگ جاتا ہے۔ پٹے لاہو۔ یا موالی ہو تو آفت۔
پیسے واپس کرنے پڑتے ہیں اور ہاتھ الگ جوڑنے پڑتے ہیں" ـــ ظاہر ہے کہ ایسی
عورت اپنے دلّال کے لئے ایک اچھا خاصا معمّا ہے۔ وہ پیشہ کرتے ہوئے بھی
اپنا جسم دوسرے کے حوالے نہیں کرتی۔ "سالی کو کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا ۔۔
سر دو دو مہینے نہیں دھویا۔ چرس کے ایک دو سگرٹ مل جائیں کہیں سے تو پھونک
لیتی ہے۔ یا کسی ہوٹل سے دور کھڑی ہو کر فلمی ریکارڈ سنتی رہتی ہے" ـــ اب
دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنا جسم کیوں کسی کے سپرد نہیں کرتی؟ چرس کے نشے سے وہ اپنے
کس احساس کو کند اور کونسی یاد کو شل کر رہی ہے؟ اور فلمی گیتوں کی دھنوں میں
اُسے کون سے نغمے کی بازگشت سنائی دے رہی ہے؟ ـــ لیکن سراج غائب
ہو چکی ہے۔ ڈھونڈو بھی غائب ہے۔ ان سوالوں کا جواب وہی دے سکتے ہیں۔ مگر
ایک روز وہ پھر کہیں سے آ سکتے ہیں۔ شاید انہی سوالوں کا جواب دینے کے لئے۔

ڈھونڈو کہتا ہے کہ ہم لاہور سے آرہے ہیں ـــ لاہور میں وہ ایک ہوٹل
میں ٹھہرتے ہیں اور سراج ڈھونڈو سے کہتی ہے "ڈھونڈو ایک برخا (برقع) لادے
مجھے" اسے پہن کر وہ گلی گلی گھومتی ہے" میں بولا یہ بھی اچھی رہی ڈھونڈو ـــ

سراج سالی کا تو مستنک پھرے لاتھا سالا تیرا بھی بھیجا پھر گیا...... آخر ایک دن اس نے تانگہ رکوایا اور ایک آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہنے لگی۔ ڈھونڈو اس آدمی کو میرے پاس لے آ۔" ڈھونڈو ایک نظر میں تاڑ جاتا ہے کہ موج شوق کرنے والا آدمی ہے اور وہ اُسے "بمبئی کا مال" دکھانے کے لیے سرائے میں لے جاتا ہے۔ "سراج کو دیکھتے ہی وہ سالا یوں بدکا جیسے گھوڑا"۔ لیکن سراج اُسے پکڑ لیتی ہے :

"اب کہاں جاتا ہے۔ میرا گھر چھڑا کر تو مجھے
اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں تجھ سے محبت کرتی تھی۔
تو نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ تو مجھ سے محبت
کرتا ہے۔ پر تو میری ساری تیاریاں چھوڑ کر بھاگ
گیا۔ آ۔۔ اب میں نے تجھے بلایا ہے۔ میری
محبت ویسی کی ویسی قائم ہے......"

عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ صرف ایک مرد کو چاہتی ہے۔ ورنہ جہاں تک جسمانی رشتے کا تعلق ہے وہ ہر مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ اگر پہلا مرد دھوکہ دے جائے اور صرف جسمانی رشتہ ہی باقی رہ جائے اور اُس کے بغیر گذر نہ ہو تو پھر جہاں ایک مرد آیا تھا۔ پہلا مرد، وہاں ایک ہزار بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مرد کی ہزار لغزش بھی اُس کا حسن اور حق ہے۔ لیکن عورت کا قدم

ایک بار بھی لڑکھڑا جائے تو گناہ ہے اور اُس کے لئے نہ گھر میں نہ برادری میں کوئی جگہ نہیں ــــ سراج جانتی تھی کہ ایک مرتبہ گھر سے بھاگنے کے بعد اب اس کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی۔ سوائے اُن کھولیوں اور چالیوں کے۔ مگر اس نے اِس پیشہ میں قدم رکھنے کے باوجود بھی اپنے جسم کو بچائے رکھا۔ وہ تو جس کا ہو چکا تھا اُسی کا ہو چکا تھا۔ مگر اُسے اوروں کے سپرد کرنے سے پہلے اُسے سچ مچ اس کا ہونا تھا۔ کسی کارخانے کی رسمِ افتتاح کی طرح کسی بڑے آدمی کا اُس سوئچ کو دبانا لازمی تھا جس سے فیکٹری حرکت میں آئے گی ــــ اور ایک عورت کے لیئے وہ بڑا آدمی اُس کا پہلا مرد ہے جس کی خاطر وہ بابل کا گھر، طاق بھری گڑیاں، آنگنوں کے جھولے، ماں جائے، سنگ سہیلی سب کچھ تیاگ دیتی ہے ــــ اور وہ مرد اس پر بھی اُس کی قدر نہ کرے تو وہ مرد نہیں نامرد ہے، زنانہ ہے چنانچہ اُس کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونا چاہیئے۔ ڈھونڈو بتاتا ہے:

"وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس سالے کے آنسو ٹپکنے لگے۔ رو رو کر معافیاں مانگنے لگا..... سراج نے مجھے اشارہ کیا۔ میں باہر کھاٹ پر سو رہا تھا۔ سراج نے مجھے جگایا اور کہا چلو ڈھونڈو' ــــ میں بولا کہاں؟' بولی 'واپس بمبئی' ــــ میں بولا وہ سالا کہاں ہے؟'

——سراج نے کہا، سو رہا ہے، —میں اس

پر اپنا برخا (برقع) ڈال آئی ہوں"

منٹو بڑا ظالم ہے۔ سوگندھی نے اپنی "ہتک" کا بدلہ لینے کے لئے ایک خارش زدہ کتے کو اپنے ساتھ سُلا لیا تھا۔ سراج ایک بے وفا مرد سے انتقام لینے کے لئے اُس پر "برخا" ڈال دیتی ہے —— محبت کی بھولی بھالی سادہ لوح لڑکیوں کو بہکا کر عصمت فروشی کی سڑک پر چھوڑ جانے والے مردوں کے لئے ہماری قانون کی کتابوں میں بھی ایسی خوفناک سزا کہیں نہیں ملے گی۔

"سڑک کے کنارے" کا مرد بھی ایک ایسا ہی خود غرض آدمی ہے۔ لیکن سراج کی طرح "سڑک کے کنارے" کی عورت بھی چورا ہے پر اپنا جسم نیلام سے پہلے، اُس کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ وہ اُس کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہے:

"یہی دن تھے —— آسمان اس کی آنکھوں کی
طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دھوپ
بھی ایسی ہی کنکنی تھی، سہانے خوابوں کی طرح
مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت
میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے"

منٹو کے دماغ کے دریچے کھلے ہیں، تمام حسیں بیدار ہیں —— آسمان کا رنگ،

دھوپ کی گرمی، مٹی کی خوشبو۔ خوابوں کی پرورش کے لئے بڑی سازگار فضا ہے اور حوا کی بیٹی جو محبت کے خواب دیکھ رہی ہوتی ہے، محبت جس کے بغیر اسکی زندگی نامکمل ہے۔ "اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اُس کے حوالے" کر دیتی ہے۔ سپردگی کا یہ لمحہ اُسے اب تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ مگر ہرجائی مرد اپنی تکمیل کر کے چلا جاتا ہے اور جاتے ہوئے کہتا ہے:

"میری تکمیل ہو گئی۔ اب مجھے تمھاری ضرورت
نہیں،— خدا اپنی پرستش کراتا ہے۔ مگر خود
بندگی نہیں کرتا۔ عدم کے ساتھ خلوت میں چند
لمحات بسر کر کے اُس نے وجود کی تکمیل کی۔
لیکن اب عدم کہاں ہے ...... اس کی اب
وجود کو کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسی ماں
تھی جو وجود کو جنم دینے کے بعد زچگی کے بستر
پر فنا ہو گئی"

یہ ایک ہرجائی مرد کے متعلق ہے۔ مگر عورت سوال کرتی ہے:

"یہ کس کا قانون ہے؟ — آسمانوں کا یا
زمینوں کا..... یا اُن کے بنانے والوں کا!"

منٹو اپنے افسانوں میں بار بار اس قسم کے سوال کرتا ہے۔ آپ ان کے

جواب سوچتے رہیے۔ مگر وہ عورت کچھ اور ہی سوچ رہی ہے۔ اُس کی زندگی ایک
اور اہم سوال سے دو چار ہے:

"میرے جسم کی خالی جگہیں کیوں پُر ہو رہی
ہیں..... میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں
میں اُبھرنے کے لیئے اُٹھ رہی ہے......؟
یہ میرے اندر دہکتے ہوئے چولھوں پر
کس مہمان کے لیئے دودھ گرم کیا جا رہا ہے
..... یہ میرا دل میرے خون کو دھنک دھنک
کر کس کے لیئے نرم و نازک رضائیاں تیار
کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات
کے رنگ برنگے دھاگوں سے کس کے لیئے
ننھی منی پوشاکیں تیار کر رہا ہے۔
یہ نقشِ قدم کس کا ہے — یہ جو میرے
پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے۔ کیا یہ میرا
جانا پہچانا نہیں؟"

ہاں وہ اُس کا جانا پہچانا ہے۔ یہ اُسی کا نقشِ قدم ہے جو اُس کی زندگی
میں اس روز آیا تھا جب آسمان نیلا تھا، دھوپ گنگنی تھی۔ اور اب وہ ایک

بچے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ مگر بچے کا باپ کہاں ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟

"یہ دنیا ایک چوراہا ہے۔ اپنا بھانڈا
کیوں اس میں پھوڑتی ہے..... یہ کس کا آنسو
میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے۔ جب سیپ
کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر چوراہے میں
گر پڑے گا تو اُنگلیاں اُٹھیں گی....."

نقّاد کہتے ہیں منٹو کا اندازِ تحریر سخت خشک ہے۔ الفاظ روکھے پھیکے اور جملے شعریت سے خالی ہیں۔ وہ انشاپردازی کی نفاستوں سے ناآشنا ہے۔ اس کی کہانیوں کے پلاٹ خالی خولی بے رنگ حقائق ہیں جن میں زبان و بیان کا حسن موجود نہیں۔ "سڑک کے کنارے" پڑھنے کے بعد اُنھیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ نیلی رگیں، اکیلی، اِس منجدھار میں، کبوتری، بیگو، ایک خط، موسم کی شرارت، سبھی شعریت میں رچی ہوئی تحریریں ہیں۔ اگر اس کی بیشتر تصانیف "شاعری" سے خالی ہیں تو اِسے الفاظ کی کمی یا انشاپردازی کی نفاستوں سے بے خبری سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ طرزِ تحریر کا فیصلہ موضوع پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ عام افسانہ نویسوں کی طرح کہانیوں کے کھوکھلے پن کو خوبصورت الفاظ اور شاعرانہ فقروں کے پیچھے چھپانے کو جرم گردانتا ہے۔ خیال کے مقابلے میں الفاظ کی حیثیت ثانوی ہے۔ بے رنگ اور برہنہ الفاظ میں جن خیالات کا اظہار منٹو نے کیا ہے، اُس کے کمال

کا ثبوت ہے۔ وہ الفاظ کا صحیح استعمال جانتا ہے۔ اُنھیں ضائع نہیں کرتا۔ اُس کی شاعری کبھی بے مقصد نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کا ترجمان ہے۔ اُس کے یہاں رومان نہیں ملیں گے۔ اس کی شاعری مرثیہ انیس کی تشبیب ہے۔ جس سے وہ زندگی کے المناک حقائق کو اُبھارنے کا کام لیتا ہے۔ وہ بچوں کی طرح رنگوں کی طرف محض اس لیئے نہیں لپکتا کہ وہ شوخ ہیں۔ کسی چابکدست مصوّر کی طرح وہ انھیں کسی خاص خیال کو واضح کرنے کے لیئے احتیاط اور سلیقے سے استعمال کرتا ہے "سڑک کے کنارے" میں بچے کی پیدائش کا منظر ملاحظہ کیجئے تخلیق کی ساعت اُس کے ہونٹوں سے ایک نغمہ بن کر بہہ نکلی ہے:

وہ میری روح پسینے میں غرق ہے.....
اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے۔ چاروں طرف
آگ دہک رہی ہے...... میرے اندر کٹھالی
میں سونا پگھل رہا ہے، دھونکنیاں چل رہی ہیں۔
شعلے بھڑک رہے ہیں ـــ سونا، آتش فشاں
پہاڑ کے لاوے کی طرح اُبل رہا ہے......
گھنٹیاں بج رہی ہیں...... کوئی آ رہا ہے،
کوئی آ رہا ہے ـــ کٹھالی اُلٹ گئی۔
یہ کس کے رونے کی آواز ہے..... میں

گود بن رہی ہوں۔۔ یہ میری ممتا کے ماتھے کی

بندیا ہے......"

اِس تشبیب کے بعد اب اُس المیہ پر غور کیجیے۔ خالص منٹوی پینترا جو ٹھیٹ صحافتی زبان میں، نرم و نازک الفاظ کی تمہید کے بعد قاری کے چہرے پہ چانٹے کی طرح گونجتا ہے:

"لاہور۔ ۲۹ جنوری

دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک

نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے

سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا......"

سماج کے عزت داروں نے "کلنک کے ٹیکے" سے بچنے کے لیے بچی کو ماں سے چھین لیا۔ ایک معصوم بچی کو سڑک کے کنارے لا پھینکا۔ بڑی ہو کر شاید وہ چوراہے پر نظر آئے گی۔ سڑک کے کنارے دوکان لگائے گی۔ کون جانے کہ اُس کے ہرجائی باپ کا کوئی نیلی آنکھوں والا فرزند، لڑکی کا بھائی ہی اُس کے یہاں سودا خریدنے آ جائے۔ اُس وقت سماج کے عزت داروں کی عزت کہاں جائے گی۔ وہ جو اپنی ہستی کی تکمیل کر کے چلا گیا تھا وہ بھی اُنہی کا بھائی بند تھا۔ وہ جو ہیرا منڈی میں دوکان سجائے بیٹھی ہے۔ اُنہی کی بہو بیٹی ہے۔ اِس منڈی کے کچرے میں ہیرے ہوں گے جو کسی کی انگشتری کا نگیں ہو سکتے تھے۔ منٹو

اپنے برہنہ ہاتھوں سے اس کچرے سے ایسے کئی جواہر ریزے ٹٹول کر نکالتا ہے، جنھیں کانچ کے بیوپاریوں نے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں کی طرح کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا ہے۔ جوہری کی آنکھیں اُن کی ظاہری آلودگی کے باوجود اُن کی قدر و قیمت کو پہچان جاتی ہیں ـــــ اُس تمام گندگی اور غلاظت کے باوجود، جن میں وہ لپٹے پڑے ہیں، اُن میں اب بھی نسوانیت کی وہ چمک موجود ہے جو صبح ازل آدم کو حوا کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ عورت کیسی بن کر بھی ماں، بہن اور بیٹی ہے۔ منٹو اُس کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ اُسے کسبیوں میں بھی گھریلو عورت کی شکل نظر آتی ہے۔ "بابو گوپی ناتھ" میں محمد رفیق طوسی جیسا تماش بین، جو رنڈیوں کا چھیتا ہے، زینت کے بارے میں یہ کہتا سنائی دیتا ہے۔ "زینت بہت اچھی عورت ہے۔ لیکن افسوس کہ بے حد شریف ہے ـــــ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں" ـــــ یہ نظر، یہ کردار نگاری منٹو ہی کا حصّہ ہے مگر ٹھہرئیے وہ اسی مشابہت پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس افسانے (بابو گوپی ناتھ) میں وہ خود، یعنی سعادت حسن منٹو بھی ایک کردار ہے۔ کہانی کا راوی سادر عبدالرحیم سینڈو کی طرح، قارئین کا کہانی کے مختلف کرداروں سے تعارف کراتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ سردار، زینت کو لوٹ رہی ہے۔ "سوسوا سو روپے روز کے ہو جاتے ہیں، جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔" منٹو ایک روز زینت سے پوچھتا ہے۔ "یہ تم کیا کر رہی ہے۔ زینت جواب

دیتی ہے :

"مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جان۔"

"بھائی جان۔" دیکھا آپ نے ! وہی عورت جو محمد رفیق طوسی کو بیوی بن کر نظر آتی ہے، منٹو کو بہن بن کے دکھائی دے رہی ہے اور اخلاق کے ٹھیکیدار کہتے ہیں "منٹو فحش نگار ہے۔ عریاں نویس ہے ....." میں ان سے کچھ نہیں کہونگا منٹو کی کسبیاں اتنی بلند سیرت عورتیں ہیں کہ یہ تسبیح خواں اور زنار پوش بزرگ جن کی پیشانیوں پر چندن کے ٹیکے اور سجدۂ ریا کے "گٹے" پڑے ہیں، ان کے پاؤں دھونے کے لائق بھی نہیں۔

"یہودی" کا لفظ ہمارے یہاں اکثر گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن "اس موذیل" کو دیکھئے جو ہر چند کہ لائسنس یافتہ رنڈی نہیں لیکن اُس سے کچھ کم بھی نہیں۔ وہ انڈرویئر تک نہیں پہنتی۔ اُسے کئی سٹاف لونڈے لئے پھرتے ہیں۔ لیکن بمبئی میں جب مذہبی فساد ہوتے ہیں تو موذیل اپنے چاہنے والے سکھ ترلوچن سنگھ کی منگیتر کو بچانے کے لئے اپنی جان دے دیتی ہے۔ بلوائیوں کی توجہ کو اُس کمرے کی جانب سے ہٹانے کے لئے وہ ننگی بھاگ نکلتی ہے۔ لیکن اُوپر کے زینے سے اُس کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ "پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی" نیچے آ رہتی ہے —— پتھر کے فرش پر —— اور اُس کے منہ، ناک اور کانوں سے بھی خون بہہ نکلتا ہے۔ لیکن بلوائی اس کے گورے جسم کو دیکھ رہے

ہیں۔ ان کی حیوانیت کو موت کا سامنا بھی سرد نہیں کر سکتا۔ ترلوچن جو سکھ ہے۔ اور بقول موذیل ایڈیٹ ہے، یہ منظر برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے برہنہ جسم کو اپنی پگڑی سے ڈھانپ دیتا ہے۔ لیکن موذیل اپنے بدن سے ترلوچن کی پگڑی جو اس کا مذہبی نشان ہے، اس کی سکھی کی علامت ہے، ہٹاتے ہوئے کہتی ہے:

"لے جاؤ اِس کو ــــ اپنے مذہب کو"

اور اتنا کہہ کر وہ جان دے دیتی ہے۔ ایک عصمت باختہ عورت کا یہ جملہ اُن بہروپیوں کی پگڑیاں اُتارتا، عمامے گراتا، عبائیں پھاڑتا اور ٹیکے مٹاتا ہوا نکل جاتا ہے جو مذہب کے مقصد کو نہیں سمجھتے اور صرف اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کے پرستار ہیں۔ اور اُس کی رُوح سے بے خبر ہیں۔ موذیل کی موت اس امر کی "یاد دہانی" ہے کہ مذہب اگر ہمیں ہمدردی اور محبت کی تعلیم نہیں دیتا، انسانیت نہیں سکھاتا تو اُسے مٹ جانا چاہیئے ــــ موذیل کی ننگی لاش مذہب کے عمامہ و دستار کی ہنسی اُڑا رہی ہے۔ موذیل کی موت ہمارے سامنے ایک سوال بن کر اُبھرتی ہے۔

مذہب کی سادگی کیا ہوئی؟

مذہب کے ان دوکانداروں کے مقابلے میں، جن کے سینے ناریک ہیں اور جن کے نزدیک مذہب کی ابتدا نفرت سے ہوتی ہے، وہ جسم فروش سوگندھی ہزار درجہ بہتر ہے جس کے گھر میں گنیش جی کی تصویر کے سامنے دیئے کی لو تلک کے

مانند سیدھی کھڑی ہے۔" جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی"۔ سو گندھی کا دھرم اب بھی زندہ ہے۔ اُس کا جسم لاکھ آلودہ سہی لیکن اس کی رُوح پاک ہے ——— اگر وہ عصمت فروش نہ ہوتی تو دیو داسی ہوتی!!!...

"دس روپے" کی سُرتیا تو اُس دھندے کی غلاظت سے بھی نا آشنا ہے جس میں اُسے پھینک دیا گیا ہے۔ وہ اس قدر الھڑ ہے کہ جب اُس کا دلال موٹر والے نوجوانوں کو گھیر کر لاتا ہے اور اُس کی ماں اُسے ڈھونڈنے نکلتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ سُرتیا گلی کے نکڑ پہ جہاں کچرے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی ہے اور ہر قسم کے فکر سے آزاد ہے۔ اُس کی ماں اُسے ڈھونڈتے وقت کہتی ہے۔" ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ سوچتی ہی نہیں۔ بس دن بھر کھیل کود چاہیے" ——— وہ اس قدر الھڑ ہے کہ اپنا پیشہ بھی اُسے کھیل ہی لگتا ہے۔" اسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی کہ موٹر سے تھی۔ جب موٹر پھرتی کھُلی کھُلی سڑکوں پہ چلتی اور اُس کے منہ پہ ہوا کے طمانچے پڑتے، اُس کے دل میں ناقابلِ بیان مسرت اُبلنا شروع کر دیتی"۔ وہ اس قدر الھڑ ہے کہ مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تو سرتیا اُن کے ساتھ گاڑی میں یا باہر اندھیرے مقاموں پہ جانے کو تفریح خیال کرتی...... وہ سمجھتی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر پہ بھی کشوری جیسے آدمی آتے ہوں گے اور اُن کو

بھی سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہوگا اور وہاں رات کو ورلی کے ٹھنڈے ٹھنڈے بنچوں یا جوہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے، سب کے ساتھ ہوتا ہوگا" چنانچہ شہاب، انور اور کفایت کے ساتھ اُس کی مہم ایک دلچسپ کھیل دکھائی دیتی ہے۔ وہ گاتی ہے ہنستی ہے، شور مچاتی ہے۔ وہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹریں ہوا کے جھونکوں اور سمندر کے کنارے کی موجوں کی طرح ہوا کا ایک جھونکا اور پانی کی ایک لہر ہے۔ آزاد اور پاک۔ اُس کی روح کی معصومیت اُن نوجوانوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے جو کسی اور غرض سے آئے تھے اور وہ کام نہیں ہوتا۔ جب وہ واپس پہنچتی ہے تو موٹر کی پچھلی سیٹ پر دو نوجوانوں کو اُن کے سروں میں اپنی اُنگلیوں سے کنگھی کر کے وہ سلا آئی ہے۔ موٹر سے اُترتے وقت وہ دس روپے کا وہ نوٹ جو شہاب نے اُسے اس کام کے لئے دیا تھا، واپس کر دیتی ہے ——— جسم ضرور بیچا جا سکتا ہے لیکن محبّت اور معصومیت کے دام وصول کرنا جُرم ہے۔ یہ اجناس فروختنی نہیں ہیں ——— موٹر جب فراٹے بھر رہی تھی تو وہ گا رہی تھی۔ "میں بن کی چڑیا بن کے۔ بن بن بولوں رے" ——— یہ بن کی چڑیا آزادی کا گیت سنا کر پھر اُس غلیظ پنجرے میں گُھس جاتی ہے جو اُس کا گھر ہے۔ وہ گاتی ہے ؎ "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں کے سب سنسار"۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُس کی یہ فطری خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔

"سرکنڈوں کے پیچھے" کی "نواب" بھی ایک اسی قسم کی الھڑ لڑکی ہے۔

سردار نے جب نواڑی پلنگ پر" اُس کے پہلے مرد سے اس کا تعارف کرایا تو غالباً اُس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے...... اُسے اس امر کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے...... اُس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اُس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی۔ اِس لیے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ وہ اُس کی ہر آسائش، ہر آرام کا خیال رکھتی۔"نواب" کے اندر جو ماں سو رہی تھی، جو بیوی موجود تھی جو عورت جاگ رہی تھی، اس سپردگی اور خدمت میں اُسے لطف آتا ہے۔ یہی عورت کی زندگی کی منزل ہے۔ اِسی منزل کی جستجو میں وہ جان دے دیتی ہے۔

منٹو کی شاردا بھی ایک ایسی ہی عورت ہے۔ اُس کا شوہر اُسے دغا دے گیا ہے۔ لیکن پہلے شاردا کی چھوٹی بہن سے ملیے۔ جسے "ابھی آٹھ دن ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔"

"لڑکی نظریں نیچی کئے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی...... نذیر کرسی سے اُٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی نذیر نے پوچھا ــــ "آپ کا نام؟" ــــ لڑکی نے جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر

اُس کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر پوچھا ـــــ "آپ
کا نام کیا ہے جناب؟" لڑکی نے ہاتھ چھڑا
کر جواب دیا ـــــ "شکنتلا" ـــــ اور نذیر کو شکنتلا
یاد آگئی، جس پر راجہ دشینت عاشق ہوا تھا۔
ـــــ 'میرا نام دشینت ہے!'

یہ تلمیح قابلِ غور ہے۔ اس شکنتلا کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سمجھنے کے لئے کچھ ایسی ذہانت کی ضرورت نہیں۔ اب اس کی بڑی بہن شاردا سے ملئے۔ نذیر جو مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا اُس کے الھڑ پن سے مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ دلّال سے کہتا ہے۔ "کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

ایک روز کریم دلال اُسے خبر دیتا ہے کہ "شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے بڑی ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اُسے ضرور راضی کر لیں گے۔" وہ سچ مچ بہت غصیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور وجہ معقول ہے۔

"میں ناراض کیوں نہ ہوں ـــــ یہ آپ کا
کریم میری بہن کو جے پور سے اُٹھا لایا ہے۔
بتائیے آپ میرا خون کھولے گا یا نہیں۔"
نذیر نے مسکرا کر اُس سے کہا ـــــ "دیکھئے
آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں

——کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو اس
کی سزا آپ اس کو دے سکتی ہیں —— یہ کہہ کر
وہ اُٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں
میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا —— یہ
البتہ میرا قصور ہے ۔ اس کی سزا بھگتنے کے لئے
میں تیار ہوں —— بتائیے آپ مجھے کیا سزا
دینا چاہتی ہیں"

اور عین اس موقع پر جب کہ قاری کا ذہن کسی دھاندلی کا منتظر ہے ۔ منٹو ایک ایسا پینترا بدلتا ہے کہ آدمی بوکھلا جاتا ہے ۔ گالی کی آواز کے بجائے اُس "مرغی خانہ" سے جہاں کریم رہتا تھا کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے ۔

"لڑکی اُٹھی —— "کہاں جا رہی ہیں آپ؟
وہ ایک دم ماں بن گئی —— "مُنّی رو رہی
ہے دودھ کے لئے" —— یہ کہہ کر وہ چلی گئی"

نذیر پرانا تماش بین ہے لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا ۔ شاید شراب کا نشہ ہو ۔ اتنے میں کریم آتا ہے :

"شکنتلا یہاں خود آئی تھی ۔ اس لئے کہ
اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ گیا ہے ۔

شارداؔ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی
کے فوراً بعد ہی اسے چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا
تھا۔ اب اپنی بچّی کے ساتھ ماں کے پاس
رہتی ہے۔

اتنے میں شارداؔ اپنی ایک سال کی بچی کو
گود میں اُٹھائے اندر کمرے میں آئی.....

بچی کو زکام تھا۔ نذیرؔ نے اُس کے لئے وکس کی بوتل منگوائی۔ منّی کم سنی کے باعث نذیر کے لئے پُرکشش تھی۔ اُس نے اس کو گود میں لے لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے ہاتھ پھیر کر اُسے سُلا دیا اور شارداؔ سے کہا —— اس کی ماں تو میں ہوں۔" شاردا بچّی کو چھوڑ کر واپس آئی تو نذیر نے کہا —— "کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟" —— ہٹیلی شاردا، غصیلی شاردا، وہ عورت جس کا شوہر اسے اور اس کی بچی کو چھوڑ گیا تھا موم کی طرح پگھل گئی۔

"شام کے سات بجے نذیر نے دروازہ کھولا۔

کریمؔ آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔"

لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کریمؔ کو اپنا حصّہ بہر حال ملنا چاہیے تھا مگر نذیرؔ کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ شاردا جے پور چلی گئی اور اب خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ "شاردا بہت کم گو تھی۔ لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اُس نے

نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن خط اس اظہار سے پُر ہوتے ...... وہ بمبئی آنے کے لئے بے قرار تھی" اور جب نذیر کی بیوی بٹوارے کے فسادات سے گھبرا کر لاہور چلی گئی تو شاردا آ گئی۔ نذیر نے اُسے اپنے گھر پہ ٹھہرایا۔ نذیر کو شاردا میں صرف جسمانی خلوص نظر آیا۔ لیکن اُس کی بچی کے لئے "وکس" منگوا کر نذیر نے اُس کا دل موہ لیا تھا۔ نذیر نے اپنی پہلی ملاقات کے دوران میں اُس سے پوچھا تھا۔ "کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟" شاردا کو نذیر کے آئینہ میں شاید اپنا پتی نظر آ رہا تھا۔ اس بار وہ جے پور سے اکیلی آئی تھی۔ منی کو وہ اپنی ماں کے پاس چھوڑ آئی تھی ـــــ نذیر ایک موج شوق کرنے والا آدمی ہے۔ لیکن وہ عام تماش بینوں کی طرح اُلّو کا پٹھا نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ منٹو کا کوئی بھی تماش بین اُلّو کا پٹھا نہیں۔ ان میں سے ہر کوئی ایک خاص کردار اور انفرادیت کا مالک ہے۔ مگر ان کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ ہاں تو نذیر ایک پڑھا لکھا، ذہین اور حساس تماش بین ہے۔ وہ شادی شدہ ہے، اُسے گھریلو زندگی کی خبر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بچّے کے بغیر گھر آباد نہیں ہوتا۔ اُسے ماں کے مرتبے کا احساس ہے۔

"ایک بار شاردا کی دودھ بھری چھاتیوں
پہ دباؤ ڈالنے سے نذیر کے بالوں بھرے
سینے پر دودھ کے قطرے چمٹ گئے تھے۔

اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی
تھی اُس نے سوچا تھا کہ ماں بننا کتنا اچھا ہے
ـــــ اور یہ دودھ - مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی
ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں ـــــ
عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی ہیں ـــــ کسی کو
پالنا، اپنے بچے ہی کو سہی - کتنی شاندار
چیز ہے "

ایڈیپس کی کہانی پھر دوہرائی جا رہی ہے - لیکن شاردا کی کہانی ابھی ادھوری ہے - وہ اُس کی مُنّی کے زکام پھنسیوں اور گلے کے لئے دوائیں منگوایا کرتا تھا" مگر اب وہ بچّی کو پیچھے چھوڑ آئی ہے -

"اب شاردا نامکمل تھی - اُس کی چھاتیاں
بھی نامکمل تھیں - اب اُن میں دودھ نہیں تھا -
وہ سفید سفید آبِ حیات ....."

یہاں ماہرِ نفسیات شاید یہ کہے گا کہ اس کہانی کے مصنّف کو بچپن میں ماں کے سینے سے الگ کر لیا گیا تھا - اُس نے جی بھر کے دودھ نہیں پیا - بہت ممکن ہے ایسا ہی ہو - لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا - ویسے یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے - طبیب کے لئے ضروری نہیں کہ ہر مرض میں وہ خود بھی مبتلا

ہو چکا ہو۔ خیر شاردا کے ہیرو کو اپنی ہیروئن بغیر بچّی کے نامکمل نظر آتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُسے اپنی بچی کی یاد ستا رہی ہو۔ منٹو اس بارے میں خاموش ہے ہاں نذیر کو اپنی بیوی کی یاد ضرور ستاتی ہے۔ وہ جسمانی حظ کی خاطر شاردا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ لیکن اب اُسے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ اس کی بیوی کی جگہ لینا چاہتی ہے۔ شاردا اب اس کے گھر میں رہتی ہے اور بیوی کی طرح اس کے آرام آسائش کا خیال رکھتی ہے۔ لیکن نذیر کا ضمیر اُسے کوس رہا ہے۔ وہ اُس کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے اور ایک دن جب اس کی جیب خالی ہے بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے۔ سگرٹوں کا سٹاک بھی ختم ہو چکا ہے۔ لیکن :

"شام کو وہ گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا
من بھلتے سگرٹ کا ڈبہ پڑا ہے ..... کھول
کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا۔
یہ ڈبّہ کہاں سے آیا ___ شاردا نے مسکرا کر
جواب دیا۔ اندر الماری میں پڑا تھا۔
اُس نے سوچا شاید میں نے کھول کر الماری
میں رکھا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن
پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا ..... "

نذیر کا زخمی ضمیر بھڑک اُٹھا:

"تمھاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں - میں
بھکاری نہیں جو تم میرے لئے ہر روز سگرٹ
خریدا کرو"

شاروا نے بڑے پیار سے کہا: "آپ
بھول جاتے ہیں - اس لئے میں نے دو مرتبہ گستاخی
کی"

نذیر نے بلا وجہ اور زیادہ غصّہ سے کہا:
"میرا دماغ خراب ہے ـــــ لیکن یہ گستاخی
مجھے ہرگز پسند نہیں"

شاروا نے کہا: "میں آپ سے معافی
مانگتی ہوں"

یہ شاروا نہیں بول رہی - ایک پتی ورتا استری بول رہی ہے - خدمتگذار
بیوی - اُس کا خلوص نذیر کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا

"نذیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ
شاروا نے کوئی غلطی نہیں کی - اُسے آگے
بڑھ کر اُس کا منہ چوم لینا چاہیئے - لیکن فوراً

ہی اُسے اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا ہے..."

نذیر کی داد بے داد بن گئی۔ اُس نے فیصلہ سنایا کہ شاردا کو جانا ہو گا۔ زادِ راہ کا بند و بست کرکے جب وہ واپس گھر آیا تو شاردا جا چکی تھی۔

نذیر کمرے میں آیا تو تپائی پر اس نے دیکھا کہ

اُس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا۔"

منٹو کے مذہب میں عورت ایک ایسی مقدس مخلوق ہے جو اپنی تمام آلائشوں کے باوجود وہ پاکیزگی نہیں کھوتی جو اُسے فطرت نے عطا کی ہے۔ اُس کی کسبیاں بھی مائیں اور بیویاں، بہن اور بیٹیاں ہیں۔ مرد کی زندگی اُن کے بغیر نامکمل ہے۔ اُن کی اصل جگہ گھر ہے۔ اگر وہ چورا ہے پر کھڑی اپنا جسم نیلام کر رہی ہیں تو اس کی ذمہ داری خود غرض اور ہوس پرست مردوں پر عائد ہوتی ہے جو محبت کے لطیف جذبات سے عاری ہیں اور انھیں بہکا کر ورغلا کر، اپنے نفس کی آگ بجھانے کے بعد انھیں سڑک کے کنارے چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، منٹو یہ جان چکا ہے کہ زندگی کا راز چاہے جاتے میں نہیں چاہنے میں ہے ___ شاردا کے سگرٹ کے ڈبے میں بھی محبت کی وہی چنگاری پوشیدہ ہے جس سے زندگی کی سردمہریوں سے ٹھٹھرتی ہوئی روحیں اپنا سینہ گرم کر سکتی ہیں۔

اینٹی فلوجسٹن

بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے نمبر ون
رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ
ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹی ملاتا ہے،
کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے ۔۔ منٹو صاحب
بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔ آپ ہیں بابو گوپی ناتھ
بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے
بمبے تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک،
کبوتری ہے...... بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجئے
کہ بڑے اینٹی فلوجسٹن قسم کے آدمی ہیں....."

یہ ہیں وہ الفاظ جن میں عبدالرحیم سینڈو، منٹو اور بابو گوپی ناتھ کا ایک دوسرے سے تعارف کراتا ہے۔ "عبدالرحیم سینڈو کا باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ دھڑن تختہ، کنٹی نیوٹلی اور اینٹی کی پینٹی پو جیسے الفاظ اُس کی اپنی اختراع تھے۔" یہ الفاظ آپ کو لغت کی کتابوں میں نہیں ملیں گے۔ لیکن منٹو کا افسانہ "بابو گوپی ناتھ" پڑھنے کے بعد ان الفاظ کی جامعیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور آدمی یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ اُن جذبات کے لئے جن کی ترجمانی سینڈو کو منظور ہے، یہی اور صرف یہی الفاظ استعمال ہونے چاہئیں۔ ان کے علاوہ اگر کوئی اور الفاظ بولے جاتے تو بات نہیں بنے گی ـــــ جیمز جوائس کے لسانی تجربوں پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ منٹو کی لغت کم از کم ایک مقالے کی ضرور محتاج ہے۔ لیکن یہ کام کسی ماہرِ لسانیات کے کرنے کا ہے ـــــ مگر یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ میں بابو گوپی ناتھ کی بات کر رہا تھا۔ اُس "خانہ خراب" کی جس کی بربادی اُس کی محبوبہ کی آبادی کا سامان بنتی ہے۔ سینڈو جب اُس کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ بڑے اینٹی فلوجسٹن قسم کے آدمی ہیں تو مجھے اپنی بیماری یاد آجاتی ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مجھے بھی سینڈو بننے کا شوق ہوا تھا۔ چنانچہ ڈمبل اور چیسٹ ایکسپینڈر خریدے گئے۔ اور سامنے چارٹ رکھ کر ورزش شروع کی گئی لیکن ایک دن ہوا لگ گئی اور سانس سینے میں تیر کی طرح اٹک گیا۔ باڈی بلڈنگ کے سارے خواب دھندلے کے دھرے رہ گئے، اُنمی جان پہ بن آئی۔ تکلیف بڑھ گئی تو ڈاکٹر نے اینٹی فلوجسٹن پلاسٹر تجویز کیا۔ پلستر لگتا تھا کہ درد کم ہونا شروع

ہوا۔ ایک عجیب میٹھی میٹھی آنچ تھی۔ پھیپھڑے کی ورم آلود جھلی کو ناقابلِ بیان سکون اور آرام کا احساس ہو رہا تھا۔ بچھڑے ہوئے محبوب کو برسوں بعد سینے سے لگانے کی کیفیت تھی۔ درد ننھی ننھی چنگاریوں کی صورت میں پھیپھڑے سے نکل کر پلستر میں جذب ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پلستر نہیں۔ کوئی ہمدمِ دیرینہ ہے جو میرا دُکھ بٹا رہا ہے ـــــ بابو گوپی ناتھ بھی اِسی اینٹی فلوجسٹن قسم کا آدمی ہے اُس کی شخصیت کو بیان کرنے کے لیئے اِس سے بہتر لفظ نہیں ملے گا۔

وہ ایک خوش عقیدہ تماش بین ہے۔ وہ کہتا ہے:

"میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار، بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا۔ اِس لیئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پہ چلا جاؤں گا....

جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے، اُس کے لیئے اِن سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

وہ جانتا ہے کہ لوگ اُس کو علانیہ لوٹ رہے ہیں۔ لیکن وہ کسی کا مشورہ رد نہیں کرتا۔ "جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ سبحان اللہ"۔ وہ کن بُری سے کن بری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر بلا سکتا ہے۔ وہ دل آزاری کرنا نہیں جانتا۔ وہ دردمند دل کا مالک ہے۔ وہ معاشرے کی راندی ہوئی روحوں کا درد چُن رہا ہے اینٹی فلو جسٹن پلاسٹر کی طرح اُن کے سینے سے چمٹا ہوا اور اُن کا دُکھ کم کرنے کے لئے انھیں اپنی زندگی کی حرارت بخش رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ مشغلہ اُسے بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ سینڈو کے شاگرد، غلام علی جیسے لوگ جو اُس کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں اُس کا خون چوس رہے ہیں۔ "اُس زمانے میں جب سب چیزیں سستی تھیں، ہر روز تقریباً سوسوا سو خرچ ہو جاتے تھے۔" وہ جانتا ہے کہ اس میں سے چیزیں کم آتی ہیں اور غلام علی وغیرہ کی جیب میں زیادہ جاتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ جب بھی وہ غلام علی کو سو روپے کا نوٹ دے گا۔ کوئی حرامزادہ غلام علی کی جیب ضرور صاف کر دے گا۔ لیکن وہ ہر بار صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا ہے اور ایک اور سبز نے کو ہوا لگا دیتا ہے۔ وہ عاشق ہے اور عشق سود و زیاں کے معاملات سے بلند و بالا ہوتا ہے۔ وہ ایک ازلی اور ابدی عاشق ہے وہ تماش بین نہ ہوتا تو صوفی ہوتا۔ صوفی اس لئے نہ بنا کہ وہ جانتا ہے کہ "رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کرواتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے"۔ ہمارے زوال پذیر معاشرے پر اس سے خوفناک طنز اور کیا ہو سکتی ہے — لیکن اپنے

اس فلسفہ کے باوجود اُسے اپنے بزرگانِ کرام سے بے پناہ عقیدت ہے جن کے مقدس مزاروں کو کچھ لوگوں نے آمدنی اور عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے ۔۔۔ بابو گوپی ناتھ ہندو ہے لیکن حضرت غوث الاعظم جیلانیؒ کی قسمیں کھاتا ہے۔ اور داتا گنج بخشؒ کے مزار پہ منّتیں مانتا ہے۔

بابو گوپی ناتھ کو "کشمیری کبوتری" زینت سے عشق ہے۔ جسے وہ زینو کے نام سے پکارتا ہے۔ منٹو کو بابو گوپی ناتھ کچھ کھویا کھویا نظر آتا ہے۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ چنانچہ منٹو اُس سے پوچھتا ہے "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"وہ چونک پڑا ۔۔۔ جی میں ۔۔۔ میں کچھ نہیں
۔۔۔ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک
عاشقانہ نگاہ ڈالی ۔۔۔ ان حسینوں کے متعلق
سوچ رہا ہوں۔ اور ہمیں کیا سوچ ہوگی؟"
سینڈو نے کہا: بڑے خانہ خراب ہیں یہ
منٹو صاحب"

اس "خانہ خراب" کے یہ الفاظ کہ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ اور ہمیں کیا سوچ ہوگی"۔ مجھے اُس "رندِ شاہد باز" کی یاد دلاتے ہیں جس نے کہا تھا ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے ؟

غالب کو جب اپنے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ کہتا ہے ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

غالب کی طرح بابو گوپی ناتھ کو بھی اپنے سوال کا جواب نہیں ملا اور وہ اپنی جان نثار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اُسے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ جب میری دولت ختم ہو جائے گی تو زینو کیا کرے گی۔ منٹو کی دوسری کسبیوں کی طرح وہ بھی اپنی اس زندگی سے بے زار ہے۔

"اُسے گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اُسے تمباکو اور اُس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ کہتا ہے :

"منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت
محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے
میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں
اس نے مجھے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس پیشے
کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے
لوٹ کر کھاتی رہیں۔ مگر اس نے ؟ میں اگر کسی
دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس
غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا۔
شریف زادیوں کی طرح سارا دن گھر میں بیٹھی رہتی
...... دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اسے یہاں لائے
ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اسے
سب گر سکھائے۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری
بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔
بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش
کر لو۔"

اس تلاش کے لئے بابو گوپی ناتھ نے اس کو ایک موٹر بھی لے دی ہے ۔

لیکن زینو کی کمائی سردار اور مینڈو کھا رہے ہیں۔

"منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت

عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تھوڑی چالاک

تو بننا چاہیئے۔ اِس کمبخت کو اپنی زندگی کی کچھ

قدر و قیمت ہی معلوم نہیں۔"

اور بابو گوپی ناتھ کی زندگی کو یہی روگ کھائے جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا کسی بھلے آدمی سے بیاہ کر لے۔ آخر کار حیدر آباد سندھ کا ایک متمول زمیندار، زینو کے آتا ہے اور اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ مینڈو اور سردار مل کر معاملہ پکا کر دیتے ہیں اور شادی طے ہو جاتی ہے۔

"منٹو صاحب، جوان خوبصورت اور بڑا لائق

آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش

کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان

کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ منٹو کی کردار نگاری کا کمال ہے۔ اُس کی رندی پر ہزار پارسائی قربان کی جا سکتی ہے۔ اُس کی بے لوث محبت ہزاروں ہرجائی مردوں کے گناہ بخشوانے کو کافی ہے۔ اُس کی دردمندی اُن ہوس کاروں کی سفاکی کا ازالہ کر رہی ہے جو تشنہ محبتوں کو جھنجھوڑ چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

"بابو گوپی ناتھ نے بڑی توجہ سے زینت کی

شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار

کے کپڑے بنوا دئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے

کہا: دھڑن تختہ!"

سینڈو نے سچ کہا تھا۔ زینو کی شادی کے بعد، محمد شفیق طوسی، غفار سائیں، سردار، غلام علی، محمد یسٰین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل اور خود عبدالرحیم سینڈو، غرض سبھی مفت خوروں کا دھڑن تختہ ہو گیا تھا۔ لیکن بابو گوپی ناتھ کی دعا قبول ہوئی تھی۔ اُس کی زینو اب اطمینان کی زندگی بسر کر سکتی تھی۔

"دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو

بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔

میں جب ہاتھ دھونے آیا تو اُس نے مجھ سے

بچوں کے سے انداز میں کہا: منٹو صاحب ذرا

اندر آ جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس

میں کیسی لگتی ہے۔"

اس دعوت میں وہ سبھی لوگ شامل تھے جن کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ بابو گوپی ناتھ سب کے ہاتھ دھلواتا ہے جو اُسے لوٹ رہے تھے۔ ایسے عفو و درگذر کی مثالیں

ادب میں کم کم ہی ملیں گی۔ اِن لوگوں کے ہاتھ نہ جانے کس کس گناہ سے آلودہ رہیں
جب میں اس منظر کا تصوّر کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بابو گوپی ناتھ
گنہ گاروں کے ایک ہجوم کو وضو کرا رہا ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن
کسی درگاہ پر گذار سکتا ہے۔

اپنی زینو کو دلہن کے لباس میں دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہونے والا شخص
تماش بین نہیں، فرشتہ ہے۔ وہ اُن تمام لڑکیوں کا باپ ہے، جن کے باپ
ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ جنھیں ان کو اپنی بیٹیاں کہتے ہوئے عار آتی ہے
اور منٹو، بابو گوپی ناتھ کی کہانی کہنے والا بہت بڑا ہمپ ٹلا ہے سینڈو نے کہا
تھا:

"بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر وَن
رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ
ہو جاتا ہے لوگوں کا۔"

منٹو کو اپنی عظمت کا احساس تھا۔ لیکن سینڈو کی بجائے اگر میں ہوتا تو کہتا "تم
اپنے عہد کے نمبر وَن رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔"

"بابو گوپی ناتھ" کی بازگشت "نطفہ" میں سنائی دیتی ہے۔ دراصل منٹو کو
اپنا یہ کردار بہت پسند تھا۔ اور جب تک اُس نے "ممی" نہیں لکھا تھا وہ اسے
اپنا بہترین افسانہ سمجھتا تھا۔ لیکن ممی لکھنے کے بعد بھی اُسے "بابو گوپی ناتھ" کی

یاد آتی رہی۔ "نطفہ" میں کہانی یوں شروع ہوتی ہے۔

"معلوم نہیں بابو گوپی ناتھ کی شخصیت
درحقیقت ایسی ہی تھی جیسی آپ نے افسانے
میں پیش کی ہے یا محض آپ کے دماغ کی پیداوار
ہے۔ میں نے جب آپ کا افسانہ پڑھا تو میرا دماغ
فوراً ایک دوست کی طرف منتقل ہو گیا.... صادقے
کی طرف..... آپ کے بابو گوپی ناتھ اور اس میں
بظاہر کوئی مماثلت نہیں لیکن میں ایسا محسوس کرتا
ہوں کہ ان کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے"

صادقے کے علاوہ "نطفہ" کا ایک کردار وہ "خان" بھی ہے جسے صوبہ بدر کر دیا گیا ہے۔ "خان" کا کردار اور اس کا فلسفہ اتنا دلچسپ ہے کہ قاری تھوڑی دیر کے لئے یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کہانی کا ہیرو کون ہے۔ صادق یا خان؟ چنانچہ کہانی کا راوی بھی اِس داستان کے آخر میں یہ کہتا ہے کہ "معلوم نہیں، جو کچھ میں نے بیان کیا ہے، صادقے کے متعلق زیادہ ہے یا خان کے متعلق"۔ ممکن ہے کہ بعض نقاد اسے کہانی کی کمزوری تصور کریں۔ لیکن ادب میں ایسی اور بھی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ جہاں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے باوجود باعثِ نزاع ادبی شہ پاروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شیکسپیئر کے

جولیس سیزر کو ہی لیجئے۔ نقاد آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس تمثیل کا ہیرو، سیزر ہے یا بروٹس؟ اور سچ تو یہ ہے کہ مصنف اگر ایسے مخمصے نہ پیش کرتے رہیں تو "نطفہ" کے خان کی طرح وہ بھی "ملک بدر" ہو جائیں ——— اس افسانے میں ہیرو کون ہے؟" کی الجھن راوی کے اس بیان سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ خود اسے بھی معلوم نہیں کہ اس میں صادقے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے یا خان کو ——— میری رائے یہ ہے کہ تنقیدی اصولوں اور کہانی کے اختتام کے اعتبار سے "نطفہ" کا ہیرو صادق ہی ہے جس کی شخصیت بعینہ اسی طرح خان کے فلسفے کے سائے میں پروان چڑھتی ہے جس طرح فاؤسٹ کی شخصیت ابلیس کی شخصیت کے سائے میں مگر اپنی زندگی کا آخری فیصلہ صادق خود کرتا ہے صادق درمیانے درجے کی فہم و عقل کا آدمی تھا۔ لیکن نہایت محنتی۔ اور یہی محنت و مشقت اُس کی دولت کا راز تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اُسے نہ شراب کی لت تھی نہ عورت کا چسکا۔

"اس نے بوتل سے تعارف کیا۔ مگر ایک دو

گھونٹ پی صرف دوسروں کا ساتھ دینے کے لئے

...... اُن کوٹھوں پر جہاں بابو گوپی ناتھ کے قول کے

مطابق دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ صادقے نے

خود کو دھوکا دینے کی کبھی کوشش نہ کی۔

وہ رنڈی کے متعلق کبھی سوچ ہی نہیں سکتا

تھا۔ لیکن اگر ملٹری کے نوجوانوں کے لئے
رنڈیاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ اُسے مل جاتا تو وہ
یقیناً اُن کے متعلق بڑے غور و فکر سے سوچنا
شروع کر دیتا ـــــ وہ کاروباری آدمی تھا"

بگر اتفاق سے وہ خان کے بُرج میں جا نکلتا ہے اور اس کے زیرِ اثر اس کی
زندگی بدل جاتی ہے :

"یہ خان اپنے علاقے کا بہت بڑا رئیس تھا۔
اُس کے دل و دماغ قوم کی فلاح و بہبُود
کے لئے ایک بہت بڑا انقلاب چاہتے تھے۔
جو ظلم و ستم کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر
لے جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سرمائے کی
لعنت سے دنیا آزاد ہو جائے۔"

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہمارے یہاں کے وہی سیاسی رہنما سرمائے کی لعنت سے
دنیا کو آزاد کرانے کی سوچ میں رہتے ہیں جو خود بہت بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں۔
مجھے سیاسیات سے اُتنی ہی دلچسپی ہے جتنی برنارڈ شا کو گوشت سے تھی۔ لیکن ہمارے
یہاں مارکس کے چیلوں کے لئے شاید یہ ضروری ہے کہ وہ خود سرمایہ دار ہوں۔ مارکس
اگر آج زندہ ہوتا تو اس قسم کی اشتراکیت کو "رومانوی اشتراکیت" کا نام دیتا۔ پیٹ

ہیں مرغ ہو، بینک میں حساب ہو، زمینوں میں مزارع ہل چلا رہے ہوں اور اناج کو بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا نہیں بلکہ بیچنے کا قصہ ہو، بلیک اینڈ وہائیٹ کا پیگ پیٹ میں ہو اور سگرٹ ہونٹوں میں تو بڑے بڑوں کو انقلاب کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ شاید یہ سرمایہ داری کی لعنت کا ہومیوپیتھک علاج ہے۔ غالباً یہ خان بھی اسی طریقۂ علاج کا قائل تھا۔" اُس نے اپنے غیض و غضب کا بڑا خام مظاہرہ کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے صوبہ بدر کر دیا گیا۔ کارل مارکس کو سرمایہ دار انگلستان کے دارالحکومت لندن میں پناہ ملی تھی جس کے برٹش میوزیم کی لائبریری میں اُس نے اپنا صحیفۂ انقلاب لکھا تھا۔ منٹو کی کہانی کے خان کو جو اپنے ملک میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے وطن سے سینکڑوں میل دور رنڈی کے کوٹھے پر پناہ ملتی ہے۔

"مگر وطن کی یاد اُسے کبھی نہیں ستاتی تھی۔

اپنے گاؤں میں ایک چھوڑ دو بیویاں تھیں۔

اُن کے متعلق اس نے کبھی تردد کا اظہار نہیں

کیا تھا اُس کو یقین تھا کہ زمینداری کی طرف سے

جو کچھ وصول ہوتا ہے اُن کے اخراجات

کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ سات آٹھ سو

روپیہ ماہوار اُس کا منیجر وہاں سے روانہ کر دیتا

تھا جو اُس کی موٹر اور شراب پر اُٹھ جاتا تھا۔

پھر اُس کا ہیرا منڈی کے ایک کوٹھے پر تھا....

ڈیڑھ دو مہینے کے بعد خان صاحب کو محسوس ہوا کہ

آپ کو اس کوٹھے کی رنڈی سے عشق ہو گیا ہے۔

آپ نے صادق کو اس راز سے آگاہ کیا ــــــ

صادق وہ رنڈی ہمارے دل کے اندر گھس گئی ہے

اس کو بدر کرنے کی ترکیب تمھارے دماغ میں

آتی ہے تو بتاؤ۔"

جلاوطن انسان اُن نازک معاملات کے لیے بھی جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے سیاسی اصطلاحات میں بات کرتا ہے۔ وہ اُس رنڈی کے خیال کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہے اور کہتا ہے اس کو شہر بدر کرنے کی ترکیب بتاؤ۔ بظاہر یہ منٹو کی شوخیٔ تحریر ہے۔ لیکن منٹو چومکھی لڑنے والا شخص ہے۔ ایک اِتنی سی بات میں اُس نے خان کی ٹریجیڈی بیان کر ڈالی ہے۔ جو لوگ دل سے سوچتے ہیں وہ بڑے خانہ خراب ہوتے ہیں۔ چنانچہ خان اُس رنڈی سے شادی کر لیتا ہے اور اسی کے گھر پر رہنے لگتا ہے۔ وہ پیتا بھی ہے۔ وہ اپنے فلسفہ سے صادق کو آگاہ کرتا ہے۔

"شراب بہت اچھی ہے خصوصاً اُس آدمی کیلئے

جو صوبہ بدر کر دیا گیا ہو۔ بوتل سے منہ لگاتے ہی

ایک نیا صوبہ اُس کے دل و دماغ میں آباد ہو جاتا ہے۔

جس میں وہ ایک کونے سے دوسرے کونے
تک جہاں چاہے اسٹول پر کھڑے ہو کر باغیانہ
سے باغیانہ تقریریں کر سکتا ہے۔ اور سرمائے
کی لعنتوں سے اُسے پاک کر سکتا ہے اور پھر
رنڈی کا کوٹھا۔ اس سے بہتر گھر تو اور کوئی ہو ہی
نہیں سکتا۔ بیوی گھریلو اور کسی قسم کی ہو تو آدمی
اُسے گالی نہیں دے سکتا۔ اگر رنڈی ہو تو گندی
سے گندی گالی بھی اُسے دی جا سکتی ہے —
اُس کی ماں کے سامنے، اُس کی پھوپھی کے سامنے
اُس کی چچی کے سامنے۔ اور اگر اس کا کوئی باپ
ہو تو اس کے سامنے...... رنڈی کا کوٹھا اور
گھریلو گھر؟ وہاں سو بکھیڑے ہوتے ہیں اور یہاں؟
ہولڈال اور ٹرنک اُٹھا دو۔ اور کسی ہوٹل
میں جا کر بڑے اطمینان سے طلاق کا کاغذ لکھ بھیجو
...... صادق! شادی وادی ہرگز مت کرنا۔
یہ دنیا ایسی ہے جہاں کسی وقت بھی تم کو صوبہ بدر
شہر بدر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی پولٹیکل لائف

میں صرف یہ سیکھا ہے کہ زندگی میں تم جس کو بھی شریک
بناؤ، اٹیچی کیس کی طرح ہونی چاہیے۔ جس کو تم ہاتھ
میں اٹھا کر چلتے ہو۔ یا اُسے وہیں چھوڑ دو۔ وہ
زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہیے ـــــ قیمتی چیزوں کو
چھوڑ دینے کا بڑا غم رہتا ہے......"

خان کا فلسفہ بظاہر بڑا عجیب و غریب اور مضحکہ خیز ہے لیکن شکسپیر کے مسخروں کی طرح اُس کی اِس مضحکہ خیز بکواس میں بڑی بڑی باتیں پوشیدہ ہیں۔ اِس میں بار بار شہر بدر کرنے کا ذکر آتا ہے ـــــ آزادیٔ گفتار جس کی پاداش میں منٹو کی کہانی کا یہ نرالا خان شہر بدر ہے، جمہوریت کا پہلا اصول ہے۔ چنانچہ وہ اگر اسٹول پر کھڑا ہو کر تقریر کرنا چاہتا ہے تو اپنا ایک حق طلب کر رہا ہے۔

"صادق کو خان، رنڈی سے شادی کے فوائد
اکثر بتاتا رہتا تھا۔ صادق ہم جھوٹ نہیں بولتا۔
یہ دنیا جس میں، ہم جیسے مخلص آدمی کو صوبہ بدر کرتے ہوئے
حاکم موجود ہیں، اُس میں رنڈی کے کوٹھے ہی کو
اپنا گھر بنانا چاہیے۔"

"لیکن تب رنڈی سے شادی کا سوال پیدا
ہوا، اور صرف ایجاب و قبول کی رسم باقی رہ گئی

توصادق پیچھے ہٹ گیا۔ خان آگ بگولا ہو گیا:

تمہاری سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں صادق۔ تم اُلّو
کے پٹھے ہو۔ شریف عورت سے شادی کر کے
خدا کی قسم تم پچھتاؤ گے یہ دنیا ایسی نہیں جس میں
شرافت سے شادی کی جا سکے۔ یاد رکھو اگر تم
شریف بنے تو صوبہ بدر کر دیے جاؤ گے۔ تم
ہیرامنڈی میں رہو۔ صرف یہی ایک صوبہ ہے
جس میں سے تم بدر نہیں کیے جا سکتے اس لیے کہ
اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنا رشتہ قائم نہیں کریگا۔"

خان کی نرالی منطق اس کی انفرادیت کی آئینہ دار ہے۔ منٹو کے تماش بین گناہ کے سمندر میں گر کر بھی اپنی انفرادیت نہیں کھوتے اور ذرا سا سہارا ملنے پر پھر اُبھر آتے ہیں۔ خان کا مسخرہ پن بڑے بڑے دانشوروں کو راستہ دکھاتا ہے۔ خان کی کردار نگاری میں منٹو ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس خاکے کے بگڑے ہوئے خطوط کے پس منظر میں تلخ حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔

منٹو گھریلو زندگی کا بہت احترام کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک گھر کی فضا، وہ چار دیواری جو ماں باپ اور بیوی بچوں سے منسوب ہے خانہ کعبہ کی طرح مقدس ہے۔ وہ خان سے کہلواتا ہے کہ "بیوی اگر گھریلو اور سگی قسم کی ہو تو اُسے

گالی نہیں دی جاسکتی"۔ لیکن اس کے مقابلے میں "رنڈی کو گندی سے گندی گالی دی جاسکتی ہے۔ اُس کی ماں کے سامنے، پھوپھی کے سامنے، باپ کے سامنے ــــ یہ کہتے وقت وہ ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے ــــ بیوی ہو یا رنڈی دونو عورتیں ہیں۔ ایک کا احترام کرتے ہیں، دوسری کی تذلیل ایک کے گھر میں اگر کوئی غیر مرد گھس آئے تو ہم پولیس کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ لیکن دوسری کے گھر میں نامحرم بھی اُس سے وہی کچھ طلب کر سکتا ہے۔ جسے فطرت نے صرف ایک مرد۔ اُس کے شوہر کے لئے مخصوص کیا ہے۔ لیکن اجنبی سے اجنبی شخص کو بھی اُس کے گھر سے نہیں نکالا جاسکتا ــــ "صرف یہی ایک ایسا صوبہ ہے جس میں سے تم بدر نہیں کئے جاسکتے۔ اِس لئے کہ اس کے ساتھ کوئی حاکم اپنا رشتہ قائم نہیں کر سکتا"۔ یہاں حاکم سے مراد وہ معاشرہ ہے جو رنڈی سے بے اعتنائی برتتا ہے وہ اقتصادی نظام ہے جس میں وہ فطرت کی امانت کو ہر کس و ناکس کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اب اِس کہانی (لطیفہ) کے دوسرے ہیرو کو لیجئے۔ لیکن یہاں مجھے ایک "لطیفہ" یاد آگیا ــــ

میں دو سال سے یہاں پشاور میں پڑا ہوں ــــ "آب دوانہ"! ــــ باڑے کا پانی پیتا ہوں، جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ "بڑا صحت بخش ہوتا ہے۔ پتھر بھی کھاؤ تو ہضم ہو جاتے ہیں۔ اس میں SALTS کی افراط ہوتی ہے"۔ پانی کے گلاس میں

یہ SALTS صاف نظر آتے ہیں ـــــ رہا "دانہ" سو وہ بھی روکھی سوکھی مل ہی جاتی ہے۔ رہنے کو جو مکان ملا ہے سو سر آج، سر تیا اور سو گندھی کی کھڑکیاں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اور کچھ نہیں کہوں گا۔ یوں تو میں "مہاجر" ہوں، اس لئے کہ امرتسر کا رہنے والا تھا جہاں بزرگوں کی جائداد تھی، جس میں میرا بھی لاکھ سوا لاکھ (جس کے سائے میں کبھی ہاتھی بیٹھتے تھے اور اب مہاجر بیٹھتے ہیں) کا تو خیر نہیں ہاں ساٹھ ستر ہزار کا حصہ تھا۔ لیکن ہٹائیے۔ جل جلا گئی۔ لیکن "مہاجر" کے لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ کہاں وہ پہلے مہاجر جو پیغمبرِ اسلامؐ کے ساتھ تھے اور کہاں ہم گناہگار بھگوڑے! مگر مہاجر کے لفظ سے زیادہ مجھے "پناہ گیر" کے لفظ سے نفرت ہے ـــــ پناہ اور اپنے وطن میں؟ اونہہ ہونہہ! لیکن جس کھولی میں میرا قیام ہے اُس میں خود میں اپنے کو "پناہ گیر" محسوس کر رہا ہوں۔ مگر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہت ہی معترضہ۔ خیر میرے گھر کے قریب ہی ایک بازار ہے۔ گھر میں جب برتن صاف کرنے کے لئے راکھ نہیں ہوتی تو میرا "ملازم" ـــــ نہایت ذلیل لفظ ہے۔ امریکہ میں ملازم نہیں ہوتے۔ وہاں سب کام بجلی کے ذریعے ہوتا ہے ـــــ ہاں جب راکھ ختم ہو جاتی ہے تو میرا، بقولِ داغ "آدمی" بازار سے راکھ لے آتا ہے۔ لیکن ایک دن وہ خالی ہاتھ آیا۔ کہنے لگا "تنور والا راکھ نہیں دیتا صاب"۔ پوچھا۔ کیوں؟ جواب ملا: کہتا تھا ہمارا نقصان ہوتا ہے۔ راکھ تو ہم سے سیمنٹ والے خرید کر لے جاتے ہیں" ـــــ سیمنٹ میں ریت ملی ہو تو پھر بھی پتہ چل جاتا ہے لیکن راکھ تو سیمنٹ

کے ٹھیکہ داروں کا جزو ایمان بن جاتی ہے۔ آپ اُسے علیحدہ ہی نہیں کر سکتے۔

اب اگر آپ یہ واقعہ کسی سیمنٹ فروش سے بیان کریں، تو وہ قرآن پہ ہاتھ رکھ کر انکار کر جائے گا کہ اللہ کا نام لیجئے میاں صاحب —— لیکن "نطفہ" کا صادق بڑا دیانتدار ٹھیکہ دار ہے۔ اُس کا ضمیر زندہ ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ خان کی زوردار شخصیت کے زیرِ اثر شریف عورت سے شادی کرنے کے بارے میں اُس کی رائے بدلتی جا رہی ہے اور اُس کی طبیعت رنڈی کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے اور کیوں نہ ہو۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ

"خان بہت خوش ہے۔ اُس کی دونوں بیویاں
وہاں سرحد میں خوش ہیں۔ اُس کی اولاد بھی خوش
ہے۔ اُن کی خیریت اُس کو اپنے منیجر کے ذریعے
معلوم ہوتی رہتی ہے ...... اور سب سے
بڑی بات تو یہ ہے کہ خان خوش ہے کبھی کبھی
وہ اُن حاکموں کے خلاف ایک بیان اخباروں
میں شائع کر دیتا ہے۔ جنھوں نے اُسے صوبہ بدر
کیا تھا اور اپنی رنڈی کو سنا دیتا ہے ——
وہ بھی خوش ہو جاتی ہے"

یہ دیکھ کر صادق کا تعصب آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک وہ

یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ رنڈی سے شادی کرنا مناسب ہوگا کہ نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی جوانی اور دولت بے دریغ کوٹھوں پہ برباد کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"میری دنیا کھوٹ کی دنیا ہے۔ اس میں
صرف ایک بٹا سو حصہ سیمنٹ ہوتا ہے۔ باقی
سب ریت ——— اور وہ بھی جس میں آدھی مٹی
ملی ہوتی ہے۔ میری ٹھیکہ داری میں جو عمارت
بنتی ہے۔ اُس کی عمر اگر کاغذ پر پچاس سال ہے
تو زمین پر دس سال ہوتی ہے ——— میں اپنے
لئے پختہ گھر کیسے تعمیر کر سکتا ہوں۔ رنڈیاں
ٹھیک ہیں۔ میں نے سوسائٹی کے اس ملبے کا بھی
ٹھیکہ لے رکھا ہے ——— ہر روز ایک نہ ایک
بوری ڈھو کر ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔

لیکن آخر کار خان کا اخلاص اُس پر غالب آجاتا ہے۔ خان کا تجربہ، خان کا فلسفہ، خان کی فصاحت و بلاغت جو اس نے سیاسی سٹیج پر سیکھی ہے اور سب سے زیادہ خان کے خلوص سے صداقت کی تعصب کی دیوار ڈھے جاتی ہے۔ اس پہ بھی شاید وہ رنڈی سے شادی کا فیصلہ نہ کرتا۔ لیکن وہ ایک ایسا تماشبین ہے، جس کا ضمیر زندہ ہے۔ وہ ایک ایسا ٹھیکہ دار ہے جو ریت سیمنٹ کی عمارت میں تو

فناوے فی صدی دھوکا کر سکتا ہے لیکن گوشت پوست کی زندہ عورت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ ایک نہایت ہی فرض شناس دھوکے باز ہے۔ وہ مکان بنانے والی سوسائٹیوں اور تعمیراتِ عامہ کے افسروں کو ضرور دھوکہ دیتا ہے۔ لیکن "ملبے کی بوری" کو دھوکا دینے کا اہل نہیں۔ اُس کی رنڈی کے بچہ ہونے والا ہے۔ اُس کا بچّہ!

"صادق نے اس رنڈی سے شادی کرلی۔
مگر اُس کے کوٹھے کو اپنا گھر نہ بنایا۔ اس رنڈی
کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اُس کی
پیدائش کے چھ مہینے بعد صادق کے دل میں
جانے کیا آئی کہ اس نے رنڈی کو طلاق دے
دی اور کہا :۔ تمھارا اصل مقام یہ گھر نہیں ،
ہیرامنڈی ہے ـــــ جاؤ اس لڑکی کو بھی ساتھ
لے جاؤ۔ اِس کو شریف بنا کر میں تم لوگوں کے
ساتھ ظلم نہیں کرنا چاہتا ـــــ میں خود کاروباری
آدمی ہوں۔ یہ نکتے اچھی طرح سمجھتا ہوں ـــــ
جاؤ، خدا میرے اِس نطفے کے بھاگ اچھے
کرے۔ لیکن دیکھو اسے یہ نصیحت کرتی رہنا کہ

شادی کی غلطی نہ کرے۔

صاؔد قے، ٹھیکہ دار کی یہ منطق اُس کے صوبہ بدر سیاسی دوست، خاؔن کے فلسفے کی طرح ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کہانی کے راوی کو اس بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ

"مجھے یہ دونوں اُسی صف کے آدمی معلوم
ہوتے ہیں جس میں بابو گوپی ناتھ موجود ہے۔
اِس دنیا میں جہاں صوبہ بدر اور شہر بدر کیا جا سکتا
ہو، ایسے آدمی ضرور موجود ہونے چاہئیں
جن کو سوسائٹی اپنے اور اپنے بنائے ہوئے
قوانین کے منہ پر طمانچے کے طور پر کبھی کبھی مار سکے۔"

ہمیں خاؔن اور صاؔدقے کے فلسفہ سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس نتیجہ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ جو ان کی کہانی کے راوی نے اخذ کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ بھی کہیں کہ طمانچے کا ہاتھ کچھ بھرپور نہیں پڑا۔ لیکن خاؔن اور صاؔدقے کے خلوص سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ رہا طمانچے کی ضرب اور اس کی شدت کا سوال سو وہ احساس پر مبنی ہے۔ بعض لوگوں کے گال کی جلد دوسروں کی بہ نسبت ذرا زیادہ موٹی ہوتی ہے۔

منٹو نے جس اعتبار سے صاؔدقے اور خاؔن کو بابو گوپی ناتھ کی صف میں

لاکھڑا کیا ہے۔ اس اعتبار سے "دودا پہلوان" بھی اُن کا ہم نشیں ہے۔ ان میں اور
اُس میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ یہ زنڈی کے کوٹھے کے مجاور ہیں لیکن اُس کو اس
صنف سے نفرت ہے۔ وہ لنگوٹ کا پکا ہے۔ اُس کی حسن پرستی ذوقِ عجم کی
آئینہ دار ہے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُس کا محبوب صلاحو رنڈیوں کا
گرویدہ ہے۔ وہ بے حد حسین ہے۔ رنڈیاں اُس پر جان چھڑکتی ہیں۔ اور جہاں
پرانے پرانے تماش بینوں کی آنکھیں شجرِ حسن کے خاص الخاص میووں کو دور دور
سے دیکھتی ہوئی پتھرا جاتی ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیئے انھیں دولت کے
اُونچے اُونچے ٹیلے بنانے پڑتے ہیں۔ وہاں صلاحو کی جھولی میں یہ پھل آپ سے
آپ گرتے ہیں۔ وہ جوان ہے، حسین ہے، دولت مند ہے اور کسی کو کیا چاہیئے۔

"کئی کنواری طوائف زادیاں اس کے عشق
میں گرفتار ہوئیں۔ اور اپنی زندگی کے سنہرے ایام
اُس کے تلوّن کی نذر کر بیٹھیں۔"

اور ان طوائف زادیوں کی طرح "دودا پہلوان" بھی جس کی بدمزاجی اور اکھڑپن
سے بڑے بڑے غنڈے اور بدمعاش بھی ڈرتے تھے۔ اُس کا غلام تھا۔

"حسین وجمیل صلاحو اس کا معبود تھا۔ اُس کے
حضور وہ کوئی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔ صلاحو
بعض اوقات شراب کے نشے میں اُسے مارپیٹ

بھی لیتا مگر وہ خاموش رہتا۔

کبھی کبھی صلاحو ناراض ہو جاتا۔ یہ وقت

دوسرے پہلوان کے لئے بڑی آزمائش کا وقت

ہوتا۔ وہ خود کو طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں پہنچاتا۔

فقیروں کے پاس جاکر تعویذ گنڈے لیتا۔ آخر جب

صلاحو موج میں آکر اُسے بلاتا تو اُسے یوں

محسوس ہوتا کہ دونوں جہان مل گئے۔"

لیکن اپنے چاہنے والوں کو ستانے والا جب الماس کے عشق میں گرفتار ہوا تو ستی گم ہو گئی۔ الماس کی ادھیڑ عمر ماں لاکھوں کے خواب دیکھ رہی تھی۔ صلاحو نے بیٹی کو پھانسنے کے لئے پہلے اس کی ماں پر ڈورے ڈالنے چاہے۔ لیکن یہ دو دھاری تلوار تھی۔ خود اس کے اپنے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ الماس جو شروع شروع میں اُس سے بے حد متاثر تھی اور اُس کے عشق کا دم بھرتی تھی۔ اِس دوہری چال سے سرد ہو گئی اور پھر طوائف زادی بن گئی۔ اب تو یہی تھا کہ دوسرے تماش بینوں کی طرح صلاحو بھی الماس کی بولی دے۔ سودا پچیس ہزار پر ختم ہوا۔ یہ رقم صلاحو نے اپنے مکان بیچ کر حاصل کی اور اُس کا دوسرا پہلوان کڑھتا رہا کہ میرا باؤ، کیا کر رہا ہے۔ الماس نے اب پیشہ ور طوائفوں کے چلتر چلنا شروع کئے اور یہ رستم جو الماس کی نتھ اتارنے کے لئے تھی اُس کی فرمائشوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور نتھ

جوں کی توں موجود رہی۔ وہ اب دس ہزار روپے اُس مکان کو گروی رکھ کر اُجاڑ رہا تھا جس میں اُس کی نیک سیرت ماں رہتی تھی۔ یہ روپیہ کب تک ساتھ دیتا۔ عدالت نے قرقی کا حکم دے دیا۔" صلاحو پریشان ہے۔ لیکن دادوا اُسے تسلیاں دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیسے ؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ شاید اُسے بھی نہیں۔ وہ سوچ رہا ہے۔ صلاحو ان طفل تسلیوں کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ صلاحو کا چاہنے والا یہ لعن طعن چپ چاپ بغیر کچھ کہے سنے برداشت کر لیتا ہے۔ یہ اُس کے عشق کا امتحان ہے۔ پائے استقلال میں لغزش نہیں آنی چاہیے۔ اپنے "باؤ" کے لئے وہ جان دے سکتا ہے۔ جان لے سکتا ہے۔ وہ شہر کا بہترین چھری مار ہے لیکن سوال پورے دس ہزار کا ہے۔ دیکھیں وہ کیا کرتا ہے۔ قتل، ڈاکہ، چوری؟؟؟

" دوسرے روز آیا تو اُس کا چہرہ شنگرف کی
طرح زرد تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بستر علالت
سے اُٹھ کر آیا ہے۔ سر مہوڑھا کر، اُس نے ڈب
سے رومال نکالا، جس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے۔
اور صلاحو سے کہا ــــ 'لے باؤ'
صلاحو قرقی کو بھول گیا اور اُس کے قدم
الماس کے کوٹھے کی طرف اُٹھے۔ پہلوان نے اسے
روکا:

نہیں باؤ ـــــ الماس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ

روپیہ قرقی والوں کو دو۔

صلاحو نے بگڑے بچے کی مانند کہا: میں

جاؤں گا!

دودے نے کڑے لہجے میں کہا تُو نہیں

جائے گا۔

صلاحو طیش میں آگیا: تو کون ہوتا ہے مجھے

روکنے والا۔

دودے کا لہجہ نرم ہو گیا: تیرا غلام باؤ۔ پر

اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

قاری چونک پڑتا ہے اور سوچتا ہے کہ پہلوان شاید اُسے ٹھکانے لگا آیا ہے جس نے اُس کے محبوب کو یہ دن دکھایا تھا۔ لیکن یہ روپیہ؟ ـــــ قرض؟ قتل؟ ڈاکہ؟ چوری؟ ـــــ نہیں، اِس روپیہ کے پردے میں بھی وہی الماس ہے جس نے دودے پہلوان کے محبوب، صلاحو کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ دودا کہتا ہے:

"وہ مجھ پہ مرتی تھی سالی۔ پر میں اُس کے ہاتھ

نہیں آتا تھا۔ تجھ پہ تکلیف کا وقت آیا تو دل نے

کہا دودے چھوڑ اپنی قسم کو۔ تیرا باؤ تجھ سے

قربانی مانگتا ہے ...... سو ...... رات اس

نے یہ سودا کر لیا۔"

دودے نے اپنی قسم توڑ دی لیکن اپنی محبت کی توہین نہیں ہونے دی۔ وہ شخص جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ "اس کا دامن عورت کی تمام آلائشوں سے پاک ہے" اپنے دامن پر بے وفائی کا داغ برداشت نہ کر سکا — دودا، قتل، چوری یا ڈاکے سے بھی یہ رقم حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ سیدھا راستہ تھا۔ مگر "ٹیڑھی لکیر" جیسے افسانے کا مصنف، جس کا ہیرو اپنی منکوحہ کو اغوا کر لیتا ہے کیونکہ اُسے بارات، وارات کی فرسودہ رسموں اور ہر پٹی ہوئی لکیر سے نفرت ہے، چوری یا ڈاکے سے روپیہ حاصل کرنے کا راستہ کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ یہ اُس کی انفرادیت کی توہین ہوتی، اُس کے افسانوں کی تکنیک کے منافی ہوتا۔ یہ اُس کے پہلوان کے کردار اور اُس کی محبت کی توہین ہو جاتی — پہلوان اگر چوری کرتا تو افسانہ ختم ہو جاتا اور پولیس کا روزنامچہ بن جاتا — ہمارے پیر و مرشد باری صاحب اکثر گنگنایا کرتے تھے ؎

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم

دودے پہلوان کی قربانی میں جدت ہونی چاہیے تھی ورنہ اُس کی کہانی کے اُوپر کسی اور مصنف کا نام ہونا چاہیے تھا — دودا پہلوان لکھ کر منٹو نے اپنے گورو کا اپمان نہیں کیا — اس کہانی کے مرکزی کرداروں کو امرتسر کا بچہ بچہ جانتا

ہے اُنھیں افسانوی کرداروں کی اہمیت دینے کے لئے کسی امرتسر والے کی ضرورت تھی؟

"ممد بھائی" بھی دو ددے ہی کا ایک بھائی ہے۔ بمبئی کا دادا یعنی بدمعاش!

"ممد بھائی رام پورہ کا رہنے والا تھا۔ اوّل درجے
کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن کا ماہر۔ اُس کے
متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں۔
ایسے چھری مارتا ہے۔ کہ جس کے لگتی ہے اُسے پتہ
بھی نہیں چلتا۔ سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے
اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔

وہ بہت بڑا دادا یا بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے
باوجود لوگ کہتے تھے کہ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔
کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔
..... صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس کی جتنی
گلیاں تھیں، اُن کی نادار عورتیں، سب ممد بھائی کو
جانتی تھیں۔ کیونکہ وہ اکثر اُن کی مالی امداد کرتا رہتا
تھا۔ لیکن وہ خود اُن کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔
اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا اور اُن کی
خیریت دریافت کر لیتا۔"

اس تعارف کے بعد ممد بھائی کسی راہن ہڈ کی طرح ہماری چشمِ تصور میں ابھرتا ہے —— غریبوں کا ساتھی، ناداروں کا دوست، کمزوروں کا مددگار —— لیکن وہ گھوڑے پر سوار، ٹوپی میں پر لگائے، تلوار لٹکائے نہیں آتا۔ وہ ایک چھریرے بدن کا آدمی ہے جس کی قیصر ولیم کی سی مونچھیں ہی اُس کی شخصیت اور انفرادیت کی ترجمان ہیں۔ اُس کے شاگرد کا بیان ہے کہ

"ممد دادا اپنی شلوار کے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر اُڑس کر رکھتا ہے جو اُسترے کی طرح شیو کر سکتا ہے۔ یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا کُھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا۔ اُس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے، جُھکتے وقت اُس سے ذراسی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا کام ایک دم تمام ہو کے رہ جائے"

لیکن اس کے باوجود عاشق حسین جب بیمار ہوتا ہے تو وہ فارس روڈ کے سارے ڈاکٹر اس کی کھولی میں جمع کر دیتا ہے۔ اور عاشق حسین کہتا ہے ——
"ممد بھائی فرشتہ ہے —— فرشتہ!" لیکن اپنے حلیہ خنجر اور مونچھوں کی وجہ سے وہ کچھ عجیب عزرائیل قسم کا فرشتہ دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ظاہری شکل و صورت

سے آدمی کا پتہ ذرا مشکل سے چلتا ہے آپ نے وہ گھٹیا اور بازاری مصرع ضرور سنا ہوگا۔ "بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی" — اس بیان کے بھونڈے پن اور غیر شاعرانہ کیفیت سے قطع نظر کرکے ذرا اس کی صداقت پر غور کیجیے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جلاد صورت شخص بڑے رحمدل ہوتے ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی رحمدلی کا اعلان نہیں کرنا چاہتے اور اپنے نرم جذبات کو کھردرے لباسوں میں چھپائے پھرتے ہیں۔ منٹو "صاحب کرامات" کی داڑھی نوچتا ہے تو شیطان برآمد ہوتا ہے۔ ممد بھائی کی خوفناک مونچھوں کے پیچھے سے فرشتہ نمودار ہوتا ہے۔

اس کہانی کا راوی خود منٹو ہے جو ممد بھائی کی قلمرو میں ایک کھولی کا مکین ہے۔ وہ بیمار پڑا ہے۔ اکیلا، بے یار و مددگار۔ اُس کی حالت بہت غیر ہے۔ بخار سے پھنک رہا ہے۔ پیاس کی وہ شدت کہ "پانی جو کھولی میں رکھا تھا ناکافی تھا۔" سوچ رہا ہے کہ کیا کروں۔ لیکن فرشتے سے کون سی بات چھپی رہ سکتی ہے۔

"ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے —
اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی۔آئی۔ڈی
ہمیں بتاتی رہتی ہے — کون آیا، کون گیا، کون
اچھی حالت میں، کون بری حالت میں۔"

چنانچہ وہ منٹو کی بیماری سے بھی آگاہ ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس کی

قلمرو میں کوئی بیمار ہو اور وہ نہ آئے۔ وہ ایک ایسا عزرائیل ہے جو دشمنوں کی جان نکالتا ہے لیکن دوستوں کو زندگی بخشتا ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا:

"منٹو صاحب آپ نے حد کر دی..... باہر والے نے مجھے بتایا کہ تم بیمار ہو۔ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممد بھائی کا متک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے ——
ارے کیا نام ہے تیرا۔ جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اُس ڈاکٹر کا۔ سمجھ گئے نا، اُس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے۔ ایک دم آ۔ سب کام چھوڑ دے اور دیکھ سالے سے کہنا سب دوائیں لیتا آئے!

پھر اُس نے ٹہلتے ہوئے کرتے کا دامن اٹھا کر پائجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا۔ میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشک رہا تھا۔ خنجر

نکال کر اس نے پہلے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس
کی زد میں آئے سب صاف ہو گئے۔ اُس نے
اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔"

کس قدر خوفناک آدمی ہے۔ چھری مارے تو ہاتھ کی وہ صفائی کہ سو قدم تک
آدمی کو پتہ بھی نہ چلے اور اس کے بعد میںنڈو کی اصطلاح میں "دھڑن تختہ"۔ اب
خنجر سے ناخن تراش رہا ہے۔ بس آدمی تھوک نگل کر رہ جاتا ہے کہ سالا بگڑ گیا
تو ـــــ لیکن ڈاکٹر آ گیا۔

"کوئی فکر کی بات نہیں ـــــ ملیریا ہے ـــــ
میں انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

ممد بھائی نے ڈاکٹر کی بات سنی اور خنجر سے
اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا "میں کچھ نہیں
جانتا۔ انجکشن دینا ہے تو دے دو لیکن اگر اسے
کچھ ہو گیا تو ـــــ"

ڈاکٹر کانپ گیا۔ "نہیں ممد بھائی، سب
ٹھیک ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی۔
"ٹھیرو ٹھیرو۔" ممد بھائی چیخ اٹھا۔ "میں کسی

کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ شخص جس کا مارا پانی نہیں مانگتا، جس کا خنجر تعویذ کی طرح اُس کے پیٹ کو چھوتا ہے اور جو اس خوفناک چیز کو بطور ناخن تراش کے استعمال کرتا ہے، کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔ انسان بھی عجب مجموعۂ اضداد ہے۔ منٹو جگہ جگہ ضدین کو اُبھارتا ہے۔ نیم کی طرح منٹو ایک ایسا پیڑ ہے جس کے پتّے کڑوے ہیں۔ پھل میٹھا۔ اُس میں جو کڑواہٹ ہے وہ ہمارے خون کے مفسد مادوں کے لئے مفید ہے۔ عصمت باختہ رنڈی کے ہاں اُسے باعصمت بیبیوں اور معصوم بچیوں کے پرتو نظر آتے ہیں، اُن کے گناہ آلود پیرہن اُس کے قلم کی روشنائی سے دھل دھلا کر ہماری آپ کی بچیوں کی چُنریاں بن جاتی ہیں۔ جن پر مائیں بڑے پیار سے گوٹا کناری لگاتی ہیں۔ رندوں کے پردے سے پرہیزگار نمودار ہوتے ہیں۔ اور قاتلوں کی بے رحم شکل و صورت کے پیچھے ممد بھائی جیسے رحمدل لوگ ملتے ہیں جو کسی کے سوئی بھی لگتے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ یہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ ڈاکٹر سوئی بھی چبھوئے اور فیس بھی لے۔ پھر فیس لینے کے لئے کیا 'منٹو بھائی' ہی رہ گیا ہے۔ ممد بھائی کو کیا منٹو بھائی کی مالی حالت کا علم نہیں تھا۔

"سالا ہم کیا نہیں جانتا۔ تم امرتسر کا رہنے والا ہے۔ کشمیری ہے۔ تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمھاری

جہان کو رونا ہے۔ اُس سے تم بیس روپے دس آنے
کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔"

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک
اُنگلی پھیری اور مسکرا کر کہا:

"منٹو بھائی کچھ فکر نہ کرو — تمہارے سب
قرضے چکا دیئے گئے ہیں۔"

ممد بھائی داوا نہیں، عرب گلی اور اس کے مضافات کا رابن ہڈ ہے۔ اُس کی
کرخت مونچھیں، تیز خنجر، درشت لہجہ اس کی انسانیت کو چھپانے کا روپ چھل ہے
وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ ڈھول گلے میں ڈال کر اپنی ہمدردی کا
اعلان کرتے پھریں۔ یہ لوگ دُکھی انسانوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں چپ چاپ!
ممد بھائی نادار عورتوں کی مدد کرتا ہے، مقروض ادیبوں کے قرضے چکاتا ہے،
لاوارث بیماروں کے یہاں ڈاکٹر بھجواتا ہے۔ اور صبح و شام اُن کی عیادت کو
آتا ہے۔ لیکن اس کے نام سے کوئی محتاج خانہ منسوب نہیں کسی ہسپتال کے وارڈ
میں اُس کے نام کا کتبہ نظر نہیں آتا۔ اور اگر 'منٹو بھائی'، نہ ہوتا تو سوائے چند
موالیوں کے اُس کا نام بھی کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ ہاں صرف پولیس کے روزنامچہ
میں ایک شخص ممد بھائی کا نام ہے جس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا..... منٹو

اس واقعہ کی تفصیل یوں لکھتا ہے:

"میں نے پوچھا بات کیا ہوئی جو ممد بھائی
گرفتار ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ عرب گلی میں
ایک عورت رہتی ہے، جس کا نام شیریں بائی ہے
اُس کی ایک لڑکی ہے، اُس کو کل ایک آدمی نے
خراب کر دیا۔ شیریں بائی روتی ہوئی ممد بھائی کے
پاس آئی اور اُس سے کہا — "تم یہاں کے دادا
ہو۔ میری بیٹی کے ساتھ فلاں آدمی نے بُرا کیا ہے
لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو" ممد بھائی
نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا "تم چاہتی
کیا ہو؟" "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اُس حرامزادے
کا پیٹ چاک کر دو!"

ممد بھائی نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔
اُس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی اور کہا —
"جا تیرا کام ہو جائے گا" — اور اُس کا کام ہو گیا۔"

قانون کو ایک بے یار و مددگار بڑھیا کا انتقام لیتے دیر لگتی اور کون جانے اس کی نوعیّت کیا ہوتی لیکن ممد بھائی کی "تعزیرات" تاخیر کی دفعہ سے ناآشنا ہے

اُس کا قانون ایک غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ معاشرے کا نظام ہے۔ وہاں انصاف کا معاملہ ہو تو بال کی کھال نہیں اُتاری جاتی۔ قانون کا تقاضا ہو تو آدمی کی کھال اُتار دی جاتی ہے۔ ممد بھائی اِس پس ماندہ سوسائٹی کا قاضی ہے۔ مقدمہ جب اُس کے سامنے پیش ہوتا ہے، تو وہ اپنے خنجر کی دھار پہ انگوٹھا پھیرتا ہے اور اپنے سوال کا جواب مانگتا ہے کہ ایک بے یار و مددگار لڑکی کی عصمت دری کرنے والے کی کیا سزا ہونی چاہیئے ؟ آیا وہ قصاص درست ہے۔ بڑھیا جس کا تقاضا کر رہی ہے ؟ — قاضی کو جب اپنے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے تو فیصلہ میں تاخیر کیسی۔

"جس آدمی نے بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی، آدھ گھنٹے کے اندر اندر اُس کا کام تمام ہو گیا۔"

ممد بھائی کی عدالت ختم ہوئی اب اُسے خود انگریز کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ وہ گرفتار ہوتا ہے لیکن ضمانت پر رہا کر دیا جاتا ہے۔ اُس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ پولیس سے اُس کا دوستانہ تھا۔ ضمانت پر جب وہ حوالات سے باہر آیا تو وہ بہت بجھا بجھا تھا۔

"منٹو صاحب، مجھے اِس بات کا افسوس ہے کہ سالا دیر سے مرا۔ چھری مارنے میں مجھ سے

غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑ گیا۔ وہ بھی اُس سالے

کا قصور تھا ـــــ ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے

سارا معاملہ کنڈم ہو گیا ـــــ لیکن مر گیا۔ ذرا تکلیف

کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔"

ممد بھائی ایک رحمدل جلّاد ہے۔ وہ اُسی نوع کا قاتل ہے جس صنف کا منٹو "دہشت پسند تھا" ـــــ خیر اب ممد بھائی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ وہ قید نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن اُس کے مشیروں کو اندیشہ ہے کہ اُس کی خوفناک مونچھیں جج کو اُس کے خلاف فیصلہ صادر کرنے پر مجبور کر دیں گی۔

"دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی جان سے عزیز

مونچھیں منڈوا دیں۔ کیونکہ اُس کی عزّت خطرے

میں تھی ـــــ لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر۔"

عدالت نے اُسے تڑی پار (صوبہ بدر) کر دیا لیکن اُس کو اس کا غم نہیں تھا۔ غم تھا تو اس بات کا کہ

"یہ سالا مونچھیں کیوں منڈوائیں۔ سالا اگر

مجھے تڑی پار (شہر بدر) ہونا تھا تو مونچھوں کے

ساتھ کیوں نہ ہوا..... خدا کی قسم ہمیں پھانسی لگا

دیتے..... پر..... یہ بے وقوفی ہم نے خود کی

......آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا۔ سالا اپنی مونچھوں

سے ڈر گیا۔

یہ کہہ کر اُس نے دو تین تھپڑ اپنے منہ پر مارا۔ "ممد بھائی

لعنت ہے تجھ پر......"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جو اُس کے

مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب دکھائی دے رہے

تھے۔

ممد بھائی جیسا آدمی شاید پہلے بھی کبھی ضرور رویا ہوگا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ مونچھوں کے احساس نے اُس کے آنسوؤں کو آنکھ سے ٹپکنے نہ دیا۔ مونچھوں کے برد پ کے بغیر اُس کا زعم و ناز کا دل ننگا ہو گیا ہے۔ اُسے یہ احساس ہے "اب ممد بھائی ہی نہیں رہا سالا" اُس میں اور عام آدمیوں میں کیا فرق رہا۔۔۔ راین ہڈ اگر شہر میں آ بستا تو وہ راین ہڈ نہ رہتا۔ اُس کی زندگی کا سارا رومان ختم ہو جاتا۔ اُس کی انفرادیت تو اسی سے قائم تھی کہ لوگ اُس کے بارے میں سوچتے رہتے کہ وہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ کس طرح کا ہے؟ اب تو ممد بھائی کی وہی حالت ہوئی ہے جو وارث شاہ کے رانجھے کی ہوئی تھی ۔

نا لے رن گئی نا لے کن پاٹے

شہر بھی چھوٹا اور مونچھیں بھی گئیں۔ مونچھوں کے بغیر اُس کے چہرے سے

نرم و نازک خد و خال عریاں ہو جائیں گے، اُس کا دل عریاں ہو جائے گا اور یہ اُس کے آئین کے خلاف ہے کہ آدمی اپنی دردمندی کا سائن بورڈ ماتھے پہ لگائے پھرے۔ اس کے علاوہ شاید اُسے ایک اور بات کا بھی احساس ہے حالانکہ اس کا اس نے اظہار نہیں کیا بلکہ اُس کو کمال صفائی سے چھپا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اُسے شہر بدر کر دیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ "اپن کو یہ غم نہیں۔ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ...." لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُسے اس کا غم ہے ــــ کم از کم منٹو کو اس کا ضرور غم ہے۔ آپ "نطفہ" کے "خان" سے مل چکے ہیں۔ منٹو کو اس کے شہر بدر ہونے کا غم تھا۔ جلا وطنی کے تصور کی یہ تکرار بڑی معنی خیز ہے۔ منٹو کو خود بھی تو امرتسر سے دیس نکالا ہی ملا تھا۔ "مرلی کی دھن" اور "رام کھلاون" دیکھیے منٹو کو بمبئی بھی بہ حالت مجبوری چھوڑنا پڑا۔ بمبئی کو اُس نے اپنا دوسرا وطن بنا لیا تھا۔ لیکن فسادات کی فضا نے اُسے وہاں آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ اُس زمانے میں بمبئی کی فضا ایسی زہرآلود تھی کہ دوست دوست کو قتل کرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ منٹو "مرلی کی دھن" میں لکھتا ہے:

"تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی۔ طرفین کے ہزاروں آدمی مرتے تھے۔ شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اُس کے افراد اپنے

تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا: "میں مسلمان ہوں، کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔"

شیام نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "اس وقت نہیں، لیکن اس وقت جب میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا، میں تمھیں قتل کر سکتا تھا۔"

شیام سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا اس وقت شاید میں بھی اسے قتل کر سکتا تھا......

بمبئی میں فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بمبئے ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بمبئی ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے جن میں سٹوڈیو کو آگ لگانے کی دھمکیاں دی ہوتی تھیں۔ کچھ ذکی الحس اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے

رہا تھا۔ میں نے اشوک اور واچا کو رائے دی

کہ وہ مجھے بمبئی ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ

ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان

وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر انھوں نے کہا میرا

دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے

پاکستان میں تھے...... میں نے بہت غور و فکر

کیا۔ مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا۔

ہٹاؤ چلیں...... شیام شوٹنگ سے فارغ

ہو کر آیا۔ میرا اسباب بندھا ہوا دیکھا تو مجھ سے

صرف اتنا پوچھا ـــ چلے ؟

میں نے صرف اتنا کہا ـــ ہاں !

اگر شیام، منٹو کو اور منٹو شیام کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا تو منٹو کا دھوبی رام کھلاون اُسے سچ مچ مار سکتا ہے۔ منٹو جب اپنی روانگی سے ایک دن پہلے دھوبی کے یہاں سے اپنے کپڑے لینے جاتا ہے تو رام کھلاون اور اُس کی برادری دارو سے دھت ہیں اور مسلمانوں سے اُن کی نفرت عروج پر ہے۔

"رام کھلاون موٹا ڈنڈا لئے کھڑا رہتا

اُس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان

میں گالیاں دینا شروع کردیں۔ ڈنڈا سر تک اُٹھا کر

وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

رام کھلاون!

رام کھلاون دھاڑا: ۔ چپ کر بے

رام کھلاون کے ......!

میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا

مجھے نہیں پہچانتے۔ رام کھلاون؟

رام کھلاون نے وار کرنے کے لئے ڈنڈا

اُٹھایا۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں پھر پھیلیں

پھر سکڑیں۔"

اور ڈنڈا اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ نفرت سے دھت ہندو دھوبی کے سینے

میں جو انسان سو رہا تھا جاگ اُٹھا تھا۔ منٹو کے یہاں یہ انسان مر کر بھی زندہ رہتا ہے

"دوسرے روز دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا"

"صاب سلام! ..... میں اندر آجاؤں؟

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر

اُس نے کپڑے پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے

اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا:۔

'آپ، جارہے ہیں سابَ ؟'

'ہاں'

اُس نے رونا شروع کر دیا: 'مجھے ماف

کر دو صاب — یہ سب دارو کا قصور تھا....

سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو....'

"سیٹھ لوگ" اِدھر بھی دارو بانٹ رہے تھے اور اُدھر بھی۔ رام کھلاون نے منٹو کو چھوڑ دیا لیکن منٹو نے خود اپنے کو مار ڈالا۔ ہمارے "سیٹھ لوگوں" نے اس کے نرم و نازک دل پہ پیہم چوٹیں لگائیں۔ آرٹ کے نام پر سیاست کے نام پر اخلاق کے نام پر گھریلو ذمہ داریوں اور فرائض کے نام پہ! ان پیہم ٹھوکروں، مسلسل ذلت اور اس ناقابلِ برداشت درد کو دبانے کے لیئے اُس نے بوتل حلق میں ٹھونس لی۔ ولائتی کی استطاعت نہ رہی تو دیسی پینے لگا۔ اُس کی بھی ہمت نہ رہی تو قرض لینے لگا اور کچھ لوگ اُسے اپنی گرہ سے پلانے لگے — ہمارے سیٹھ! — لیکن منٹو مفت کی دارو پی کر بھی کسی کو نہیں مار سکتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو مار لیا — مجھے اُس کا افسانہ "شہید ساز" یاد آرہا ہے۔ ہمارے سیٹھ لوگ، جن پہ کبھی کبھی ادب نوازی کا دورہ پڑا کرتا ہے، شاید کبھی اسے بھی پڑھنا

پسند فرمائیں۔ خود نہ پڑھ سکتے ہوں تو کسی اور سے پڑھوالیں ـــــ اُن کے ہاں
تو ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔

کھمبے

سہرے کے پھول اور میّت کے پھول ــــ ہمارے یہاں پھولوں کے دو
بڑے مصرف ہیں۔ اور اگر آپ بارات یا جنازے کے ساتھ نہیں ہیں اور آپ کے
ہاتھ میں پھولوں کے ہار ہیں تو دیکھنے والوں کے ذہن میں پہلا تصور رنڈی کے
کوٹھے کا ہوگا اور آپ کو فوراً تماش بینوں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے گا۔
یہ بات کم ہی لوگوں کے ذہن میں آئے گی کہ چنبیلی کے ہار جو آپ لیے جا رہے
ہیں آپ کی منکوحہ بیوی کے جوڑے یا آپ کی کوری صراحی کی گردن کے لیے
بھی ہو سکتا ہے ــــ وقت اگر شام کا ہو تو بات ننانوے فیصد پکی ہے کہ حضرت
"مسجد کے زیر سایہ" تشریف لے جا رہے ہیں "گناہ بخشوانے"۔ اُدھر کا نہیں اور
ارادہ گھر کا ہے تو بھی" وہ بات پکی ہے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار ہوں

اور پنواڑی کے ہاں رُک جائیے۔ پان لینے کے لیئے۔ فوراً پوچھے گا کہ تمباکو بھی پڑے گا۔ اور چونا تو خیر ہوگا ہی "جیا دتی"۔ علاقہ ایسا ویسا ہو تو وہی ہوگا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔

دلّی کی بات ہے۔ فتح پوری سے میں گھر کو آرہا تھا۔ موسم کے مطابق پھول والے یہاں مولسری، چنبیلی، جوہی اور موتیا کے ہار بیچا کرتے تھے ۔۔ اب یہ میری "بدقسمتی" ہے کہ مجھے رنگوں، روشنیوں، بچّوں کی مسکراہٹوں اور اسی نوع کی غیر مادّی 'چیزوں' سے عشق ہے۔ انہی میں خوشبوئیں بھی شامل ہیں بارش کے پہلے چھینٹے کے بعد مٹی کی خوشبو، مہندی رچے ہاتھوں کی خوشبو...... پھولوں میں مجھے چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو بہت بھلی لگتی ہے۔ چنانچہ اُس شام بھی جب میں فتح پوری سے گذر رہا تھا، چنبیلی کے ہار دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے "پرانے تماش بینوں" کی طرح ہار خریدے اور انھیں اپنی بانہہ پر لٹکا لیا۔ جب میں اُس ہوٹل کے قریب پہنچا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں تو بجلی کے کھمبے سے ایک سایہ سا الگ ہوا اور میرا سایہ بن گیا۔ میں چونک پڑا۔ دلّی کے اشرافوں کی طرح دلّی کے جیب کترے بھی مشہور تھے۔ بسوں اور ٹرامیوں میں جگہ جگہ اشتہار لگے تھے کہ جیب کتروں سے ہوشیار رہیئے! ۔۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا سایہ میرے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہ تھا، پٹیاں جمی ہوئی تھیں، کان کے اُوپر بیڑی اڑس رکھی تھی۔

کوئی مال وال چاہیئے صاحب!" اُس کا سونے کا دانت چمک اُٹھا۔

"دور نہیں جانا پڑے گا......"

یہ اُس مہم سے پہلے کا واقعہ ہے جس کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ اُس وقت مجھے ہوٹل کے "دستر خوان" کا حال معلوم نہیں تھا۔ خیر اس شخص نے میرے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار دیکھ کر مجھے اس بازار کا گاہک سمجھا، جس کا وہ دلّال تھا۔ اور اُسے مایوس ہونا پڑا۔ آج جب کہ میں منٹو اور دلّی کی باتیں کر رہا ہوں تو مجھے کھمبے کا وہ سایہ یاد آ رہا ہے جس نے میرا تعاقب کیا تھا۔ اور اس کے تصور سے مجھے "سراج" کا ڈھونڈو یاد آ رہا ہے۔ ڈھونڈو! ۔ ذرا نام ملاحظہ کیجئے۔ ڈھونڈھنے والا

"اُس کا کام اپنے مؤکلوں کے لئے، اُن کی
خواہش اور پسند کے مطابق ہر رنگ اور ہر نسل
کی لڑکیاں ڈھونڈنا تھا۔"

ڈھونڈو، ہمیشہ ایرانی ہوٹل کے پاس، بجلی کے کھمبے سے لگ کر کھڑا رہتا۔

"کھمبا اُس کا نشان بن گیا تھا جب میری نظر
اس کھمبے پر پڑتی۔ جس پر جگہ جگہ چونے اور کتھے کی
کی اُنگلیاں پونچھی گئی تھیں، تو مجھے ایسا لگتا کہ ڈھونڈو
کھڑا ہے اور کالے کانڈی اور سنگے کی سوپاری والا
پان چبا رہا ہے

کھمبا کافی اُونچا تھا۔ ڈھونڈو بھی دراز قد تھا۔

۔۔۔۔کھمبے کے اُوپر بجلی کے تاروں کا ایک جال سا

بچھا تھا۔ کوئی تار دور تک دوڑتا ہوُا دوسرے کھمبے

کے تاروں میں مدغم ہوگیا تھا۔ کوئی کسی بلڈنگ میں

اور کوئی کسی دوکان میں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ

دوسرے کھمبوں سے مل کر گویا سارے شہر پر چھایا

ہوا ہے۔

اِس کھمبے کے ساتھ ایک بکس تھا۔ جس کے ذریعے

سے وقتاً فوقتاً تاروں کی درستی وغیرہ کی جانچ پڑتال

کی جاتی تھی۔ ڈھونڈو بھی اسی قسم کا بکس تھا جو لوگوں

کی جنسی پڑتال کی خاطر کھمبے کے ساتھ لگا ہوُا تھا۔

بھڑوے کا پیشہ شاید اسفل ترین پیشہ ہے۔ عصمتوں کی کمشن کھانے والا معاشرے کی وہ تلچھٹ ہے جسے گندی نالی بھی قبول نہیں کرتی۔ قاتل چور حتیٰ کہ غدّار تک کو معاف کر دیا جاتا ہے لیکن بھڑوے کے نام پر ہمیں ایسی آلودگی کا دھیان آتا ہے کہ گھن آنے لگتی ہے۔ لیکن یہ کھمبا، لوہے کا کھمبا، بے حس دھات کا کھمبا جو عورتوں کو سونے نہیں دیتا اور چند سکّوں کے عوض نہایت ہی بے دردی سے وہ متاع بیچتا ہے جو حوّا کی بیٹیوں کی سب سے مقدّس امانت ہے۔ منٹو کے طلسماتی قلم کے مس سے یہ کھمبا بھی ایک اِنسان بن جاتا ہے۔ محبّت کا جادو اُس کی سرد اور بے حس نسوں میں بھی انسانیت کی

وہی لہر دوڑا دیتا ہے جو منٹو کے افسانوں کا امتیازی نشان ہے۔

"سراج" کی مارا ماری اور دھاندلی نے اُسے پریشان کر رکھا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ لڑکی جواب تک کنواری ہے آخر ہے کیا؟ لیکن اس سوال کے علاوہ ڈھونڈو کے ذہن میں ایک اور سوال بھی موجود ہے۔ جسے سمجھنے سے وہ قاصر ہے لیکن اُس کی باتوں سے بار بار اس کا اظہار ہوتا ہے۔

"منٹو صاحب آج سالی نے پھر ٹنٹا کر دیا۔
وہ تو جانے کس دن کا ثواب کام آ گیا۔ ورنہ
ڈھونڈو اندر ہوتا...... میں نے لاکھ لعنت
بھیجی اپنی ہشت پشت پر کہ حرامی جب تو اس
چھوکری کو تو پھر کیوں اس کو نکال کر لاتا ہے۔
— تیری ماں لگتی ہے یا بہن ؟

ماں یا بہن ؟ — منٹو کا یہ پرانا فلسفہ ہے۔ بابو گوپی ناتھ کی زینو، منٹو کو بھائی کہتی ہے۔ اب سراج کا بھڑوا بھی کچھ ایسی ہی بات کر رہا ہے۔ لیکن محبت جیسا لطیف اور پاکیزہ جذبہ جسے وہ وزیر کو بھی نہیں سمجھا سکا تھا، اتنی آسانی سے ایک بھڑوے کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ مگر ہمیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ بجلی کے کھمبے میں برقی رو دوڑ رہی ہے۔ وہ گنگنا رہا ہے۔ ذرا کان لگا کر سنئے۔ وہ اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ لیکن آپ

"پھر تم اُسے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

ڈھونڈو خاموش ہوگیا۔ کان میں اُڑسے ہوئے

سگرٹ کا ٹکڑا نکال کر اُس نے سلگایا اور صرف اتنا

کہا: 'میں نہیں چاہتا کہ وہ جائے'۔

'کیا تم اس سے محبّت کرتے ہو؟'

اُس کے کان اس لفظ سے ناآشنا ہیں۔ اُس کا پیشہ محبّتوں کا توڑ ہے۔ ردِّعمل ہے اُس کے مفاد کے منافی ہے۔ وہ لوگوں کی جنسی پڑتال کا بکس ہے۔ وہ کھمبا ہے!

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں منٹو صاحب"۔ پھر

اُس نے دونوں کان پکڑ کر کھینچے۔ "قرآن کی قسم

میرے دل میں ایسا پلید خیال کبھی نہیں آیا۔ مجھے

بس...... بس کچھ اچھی لگتی ہے۔"

وہ اُس جذبہ کو سمجھنے سے قاصر ہے جو اُس کے دل میں ابھی ابھی بیدار ہوا ہے اُس کی کیفیت کچھ کچھ اوائل شباب کی سی ہے۔ جب بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ لیکن اپنی قسم کے باوجود، کہانی کا راوی جب اُس کی سراج کو اُس سے اطلاع دیئے بغیر لے جاتا ہے تو ڈھونڈو کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔

"ڈھونڈو کو جب میرے اِس خفیہ سلسلے کا پتہ

چلا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ اُس نے مجھے صفائی

کا موقعہ نہ دیا۔ صرف اتنا کہا، "منٹو صاحب آپ
سے یہ اُمید نہ تھی" ـــــ یہ کہہ کر وہ کھمبے سے ہٹ کر
ایک طرف چلا گیا۔"

ڈھونڈو کا یہ ردِ عمل اُس کے جذبات کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ لیکن جب سراج اپنے پہلے چاہنے والے پر "بُرخا" ڈال کر دوسری جسم فروش عورتوں کی طرح پھر منڈی میں آتی ہے تو وہ جذبات پھر سو جاتے ہیں۔ منٹو کو اِس مہم کی تفصیل سناتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

"اب وہ قصّہ خلاص ہو گیا ہے۔"

یہ قصّہ بڑا ذو معنی ہے۔ یہ قصّہ صرف سراج ہی کا قصہ نہیں۔ ڈھونڈو کا بھی قصّہ ہے۔ اوروں کی خاطر چھوکریاں ڈھونڈنے والا شاید خود بھی محبّت کی تلاش کر رہا تھا۔ لیکن سراج جس نے اب تک اپنا جسم بچائے رکھا تھا اپنی زندگی کا یہ نیا دور شروع کرنے کے بعد اب اُن جذبات کا کیونکر جواب دے سکتی ہے جو ڈھونڈو کے دل میں بیدار ہوئے تھے۔ ڈھونڈو کو اس کا افسوس معلوم ہوتا ہے۔ لاہور سے واپسی پر جب وہ منٹو سے ملتا ہے تو پوچھتا ہے۔

"سناؤ منٹو صاحب؟"

"کیا سناؤں ڈھونڈو ـــــ بس گذر رہی ہے"

ڈھونڈو مسکرایا۔ "ٹھیک کہا آپ نے۔

بس گذر رہی ہے ۔اور گذرتی جائے گی ۔۔۔

لیکن یہ سالا گذرتے رہنا یا گذرنا بھی عجیب چیز

ہے ۔"

ڈھونڈو کے یہ الفاظ اُس نظام پر ایک خوفناک طنز ہے ۔جس نے آدمیوں کو کھمبے بنا دیا ہے ۔اُن کی نسیں اینٹھی ہوئی ہیں ۔ڈھونڈو دن ڈھلے اپنا دھندا شروع کرتا ہے اور صبح کے چار بجے تک اپنے بھائی بندوں کی سفلہ خواہشوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے ۔اُس کی زندگی بے کیف ہے بے رنگ ہے ۔وہ پنواڑی کا تولیہ ہے جس کے ساتھ ہر گاہک اپنی کتھا اور چونا لگی انگلیاں پونچھ کر نکل جاتا ہے ۔وہ قحبہ خانے کا پائے دان ہے ۔اُس کی زندگی ایک اکتا دینے والی کہانی ہے ۔جس کا ہر کردار ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔وہی چھوکریاں، وہی تماشبین، وہی شراب، وہی ان کی واہیات باتیں بھونڈے مذاق کھوکھلے قہقہے ..... ایک ذراسی ذرا کے لیے سراج نے اس بے کیفی کو توڑا تھا لیکن وہ بھی اُس سڑک پر لڑھک پڑی جس پر کوئی موڑ نہیں اور کھمبے کے میٹر کی سوئی نے جس برقی رو کا اشارہ کیا تھا وہ پھر ختم ہو گئی ۔

"بس گذر رہی ہے اور گذرتی جائے گی ۔"

ڈھونڈو نے پھر سپر ڈال دی ۔لیکن واقعات کی رو پہ بہتے بہتے وہ کسی فلسفی کی طرح یہ کہہ گیا :

"یہ سالا گذرتے رہنا یا گذرنا بھی عجیب چیز ہے"

سوال پیدا ہوتا ہے — کیوں؟ — اس کا جواب اس نظام کو دینا ہوگا جو انسانوں کو کھمبے اور مشینیں بنا دیتا ہے — ڈھونڈو ایک کھمبا ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا!

اب ڈھونڈو کے ایک اور بھائی "سہائے" سے ملیے۔

سہائے کا کردار ۱۹۴۷ء کے خونیں پس منظر پر اُبھرتا ہے۔

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ مسلمان اور ایک
لاکھ ہندو مرے — یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے
— ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا
کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور
زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے
ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم
ہو گیا، مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔
وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے
مذہب شکار کیا جا سکتا ہے — مذہب، دین،
ایمان، دھرم، یقین، عقیدت۔ یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے
جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے — چھرے،

چاقو یا گولی سے یہ فنا نہیں ہو سکتا۔"

اور چوتھی چیز جو منٹو کے اکثر افسانوں کی بنیاد ہے' یہ ہے کہ مذہب کی روح کو عصمت فروشی جیسا ذلیل دھندا بھی فنا نہیں کر سکتا۔ مذہب کی یہ روح کیا ہے؟ اس کا جواب سہائے کا کردار ہے۔ جس طرح اناج کے دلال کی کاریگری اسی میں ہے کہ وہ گھُن کھائے گیہوں بھی کسی کے سر منڈھ دے، اسی طرح عورتوں کے جسم کی کمشن وصول کرنے والے کا کمال اسی میں ہے کہ وہ روگی سے روگی جنس بھی بیچ ڈالے۔ پیٹ کا بھوکا تو شاید نوالہ اُٹھانے سے پہلے کچھ دیکھ ہی لے گا لیکن جنسی بھوک کا مارا ہوا کچھ نہیں دیکھتا۔ اس لئے بھڑوا بلا جھجک اُسے وہ روگ پیش کرتا ہے۔ جن کا ذکر عزیز ترین دوستوں سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تماش بین رنگے ہوئے ہونٹ دیکھتا ہے' رنگ کے نیچے جو دیمک خوردہ لکڑی ہے اُسے نہیں دیکھتا۔ اور بھڑوا یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو خاموش کر دیتا ہے کہ گاہک کی آنکھیں ہیں —— مگر سہائے؟

"وہ دھوکا فریب نہیں کرتا۔ رات زیادہ
گذر گئی ہے۔ اور آس پاس پانی ملی شراب ملتی ہے
تو وہ صاف کہہ دیتا صاحب اپنے پیسے ضائع
نہ کیجئے..... اگر کسی لڑکی کے متعلق اُسے شک ہے
تو وہ چھپاتا نہیں تھا۔"

چلئے ٹھیک ہے۔ دوسری اجناس کی منڈیوں میں بھی شاید ایسے بہت سے لوگ

مل جائیں جن کے ہاں گندم کے نام سے جو نہیں بیچے جاتے۔ لیکن یہاں نے ہمارے بابو گوپی ناتھ
کی شکل میں پیش ہوتا ہے۔

"وہ اُن تمام لڑکیوں کو جو اس کے دھندے
میں شریک تھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ اُس نے
ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹ
کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع
کراتا تھا..... وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے
پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے.....
ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اُس نے
مجھ سے کہا۔ آمینہ اور سکینہ چھٹی پر ہیں۔ میں ہر ہفتے
ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر کسی ہوٹل
میں جاکر ماس وغیرہ کھا سکیں۔ یہاں تو آپ جانتے
ہیں سبھی وشنو ہیں۔"

دیکھا آپ نے --- وہ بھڑوا ہے لیکن اپنی پستی کے باوجود کردار کی کس بلندی
کو پہنچا ہوا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مذہب کی روح کیا ہے۔ وہ اپنے دھرم میں پکا ہے
لیکن دوسرے کے مذہب کا بھی احترام کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک گوشت کھانا
بھی جزوِ ایمان ہے۔ چنانچہ وہ امینہ اور سکینہ کو بھی دو دن چھٹی دے دیتا ہے

تاکہ وہ گوشت کھا سکیں۔ بظاہر یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو مذہب کے خام پیمانے سے دیکھیں گے تو سہائے کی مذہبی رواداری آپ کو مرعوب کئے بغیر نہیں رہ سکے گی ـــ اُس کی رواداری کا ایک اور ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ اُس نے احمد آباد کی ایک ہندو لڑکی کی شادی مسلمان سے کرا دی ہے۔ اُس کے خلوص کا جواب اُس ہندو لڑکی کا خط ہے جو اُسے لاہور سے آیا ہے اور جس میں لکھا ہے کہ میں نے داتا کے دربار میں ایک منّت مانی تھی جو پوری ہوئی، اب میں نے یہ منّت مانی ہے کہ تمھارے تیس ہزار روپے جلد جمع ہو جائیں تاکہ تم بنارس جا کر بزازی کی دکان کھول سکو ـــ بزازی کی دکان سہائے کی زندگی کا نصب العین تھی۔ اس کام کے لئے اُسے تیس ہزار کی رقم چاہیے تھی اور وہ اس قدر صاف گو ہے کہ کہانی کے راوی کو بتا چکا ہے کہ میرے پاس بیس ہزار جمع ہو چکے ہیں باقی ماندہ کے لئے وہ ہندو لڑکی مسلمان بزرگ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر منتیں مان رہی ہے۔ وہ ایک "عصمت باختہ" لڑکی ہے اور وہ ایک "بھڑوا"۔ ان "گنہ گار" لوگوں کا اخلاص اور ایمان "پرہیزگاری" کے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔

مگر ایک طرف تو یہ رواداری اور انسانیت ہے اور دوسری طرف وہ نفرت اور بہیمیت ہے جس کا مظاہرہ صبحِ آزادی کو ہوا تھا۔ اس فضا سے افسردہ ہو کر ممتاز بمبئی چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے اور روانگی سے کچھ روز قبل بھنڈی بازار سے گزرتے ہوئے، جو مسلمانوں کا علاقہ تھا، فٹ پاتھ پر سہائے کو گٹھڑی بنے

دیکھتا ہے

"اُس کی ٹول کی قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا
کرتی تھی۔ لہو سے لتھڑی ہوئی تھی۔ زخم شاید
پسلیوں کے قریب تھا۔ میں نے احتیاط سے
اُس کا کندھا پکڑ کر ہلایا...... اُس کے سارے
جسم میں تشنج پیدا ہوا — "آپ؟ — آپ؟
...... میرے دن پورے ہو چکے، بھگوان کو
یہی منظور تھا"

لیکن بھگوان کا یہ پجاری اُس کی مرضی پر لبّیک کہتے وقت مذہب کی اُس روح کو نہیں بھولتا جو بھگوان نے اُسے بخشی ہے۔ عورتوں کا دلّال سہائے مذہب کے ظاہر کا نہیں، باطن کا پرستار ہے۔ مرتے وقت یہ روح، بھگوان کی یہ دین ایک امانت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

"اُس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے
ہوئے قمیص کے بٹن کھولے مگر جب ہمت نہ
رہی تو مجھ سے کہا:
"نیچے بنڈی ہے — ادھر کی جیب میں۔
کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں — یہ سلطانہ

کا مال ہے۔ آج اسے بھیجنے والا تھا کیونکہ

خطرہ بڑھ گیا ہے...... آپ اُسے دے دیجئے گا

اور...... کہیے گا فوراً چلی جائے...... لیکن

اپنا خیال رکھیے گا"

سلطانہ بھی اُس کے دھندے میں شریک تھی اور اُس کی 'بیٹی' تھی۔ بھگوان کا یہ بھگت مرتے مرتے بھی امانت میں خیانت نہیں ہونے دیتا...... وہ مسلمانوں کے علاقہ میں گھائل ہوا ہے لیکن وہ ممتاز کو مشورہ دیتا ہے کہ "اپنا خیال رکھیئے گا" اُس کے دل میں انتقام کا خیال نہیں آتا۔ اُس کی روح تعصبات سے بلند و بالا ہے۔

"جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر جہاز سے

نیچے اُترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا

تھا — اُس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا — میں

جگل سے مخاطب ہوا: "کیا تمھیں ایسا معلوم

نہیں ہوتا کہ ممتاز سہائے کی روح کو بلا رہا ہے

— ہم سفر بنانے کے لئے؟"

جگل نے صرف اتنا کہا: "کاش میں سہائے

کی روح ہوتا۔"

سہائے کی روح مذہب کی روح ہے۔ رواداری، انسانی ہمدردی اور بھگوان

کی روح! سہائے کا ذلیل پیشہ اِس روح کو ملوث نہیں کر سکا۔ بظاہر یہ تضاد ناقابلِ فہم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسان اسی مجموعۂ اضداد کا نام ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کا ایشر سنگھ اپنے اندر یہی تضاد دیکھ کر چیخ اُٹھا تھا۔

"انسان ماں یا بھی عجیب چیز ہے۔"

یہ منجدھار

زندگی ایک گرداب ہے جس میں انسان خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے' —— کس قدر پٹی ہوئی بات ہے۔ لیکن ہے اور اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ انسان اور موجوں کی اس آویزش سے ہزار ڈرامے جنم لیتے ہیں۔ کبھی وہ تنکے کا سہارا لیتا ہے اور کبھی بہتے ہوئے شہتیروں سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ برہنہ ہاتھوں سے بھی موجوں کا مقابلہ کرتا ہے اور کبھی ثابت و سالم کشتی کو بھی اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ڈوب کر اُبھرتا ہے اور اُبھر کر ڈوبتا ہے۔ کہیں بادِ شرطہ ہے اور کہیں بادِ مخالف!

زندگی کی اِسی کشمکش سے ڈرامہ نگار اپنا مواد حاصل کرتا ہے۔ اُس کے پلاٹ

کبھی تجربہ ہوتے ہیں، کبھی مشاہدہ۔ انجام کبھی خوش آئند ہوتا ہے کبھی دردناک۔ کبھی کامیڈی اور کبھی ٹریجڈی ــــ اس کشمکش کی مختلف داستانوں کی ٹیکنیک، انجام اور کرداروں کی ذہنی ساخت سے نقادوں نے کچھ نتیجے اخذ کر لیے ہیں۔ جن میں زمان و مکان کی وحدتیں اور اسی نوع کے کئی اور اصول ہیں جن کا ڈرامے کی درسی کتابوں میں ذکر آتا ہے۔ لیکن اس بدلتی ہوئی دنیا میں کسی چیز کو قیام نہیں۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ کئی ایسے اصول بھی بدل گئے ہیں جنھیں کل تک اٹل سمجھا جاتا تھا۔ سٹیج کی نئی اختراعوں نے یونانی ڈرامہ کے کورس کو پس پردہ پھینک دیا۔ مائیکروفون اور لاؤڈ سپیکر نے لہجہ اور آواز کی نوک پلک نکال کر اس اصول کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کہ ایکٹر کی آواز زوردار ہونی چاہیے۔ اور ریڈیو کی ایجاد نے زمان و مکان کی وحدتوں کے تصور کو تہ و بالا کر دیا اور سین سینریوں کو لپیٹ کر گودام میں رکھ دیا۔ ریڈیو ڈرامہ صرف آواز کی دنیا ہے۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے منٹو کا تعلق اسی دنیا سے ہے ــــ آگ بجھانے والے انجنوں کی ٹن ٹن، ٹریفک کا شور، دندناتی ہوئی ریل گاڑیاں، بموں کے دھماکے، ہوائی جہازوں کی گھن گرج، نغموں کا زیر و بم، الفاظ اور آوازیں، اس دنیا کے اصول ہیں۔ لیکن منٹو نے یہ اصول کتابوں سے نہیں سیکھے۔ منٹو جیسے فن کار مکتب کی پیداوار نہیں ہوتے ان کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جنھیں عرفِ عام میں "جینیئس" کے فرسودہ لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ منٹو کو میں "عظیم ڈرامہ نگار" قسم کے لیبل سے متعارف نہیں کرانا چاہتا

اُس کا اصل کارنامہ اس کے افسانے ہیں جن میں وہ بلا شبہ دنیا کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے دوش بدوش کھڑا ہے لیکن اُس کے ڈرامے بھی اُس کی جدتِ طبع کے آئینہ دار ہیں اور شاید پاکستان و ہند میں وہ ریڈیائی ڈرامہ کا بھی اُستاد کہلانے کا مستحق ہے۔ اِس صنف میں بھی وہ پٹی ہوئی لکیر پر چلتا نظر نہیں آئے گا۔ اُس کی ٹیکنیک میں تکلف نہیں ملے گا اور یہ احساس نہیں ہوگا کہ فلاں کھیل لکھتے وقت اُس کے سامنے ڈرامہ نگاری کے اصولوں کی کوئی درسی کتاب کھلی پڑی تھی۔ وہ تقلید کا قائل نہیں VAN GOCH اور GAUGIN کی طرح وہ اپنے اصول خود بناتا ہے۔ وہ ایسا مصور ہے جسے رنگوں کا امتزاج قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے ڈرامہ ہو کہ افسانہ، اُس کی ہر تخلیق پر منٹو کی مہر لگی ہے۔ اپنے ریڈیائی ڈراموں کے پہلے مجموعے "آؤ" کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے۔

"یہ ڈرامے روٹی کے اس مسئلے کی پیداوار ہیں جو اُردو کے ہر ادیب کے سامنے اُس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ مکمل طور پر ذہنی اپاہج نہ ہو جائے ——— میں بھوکا تھا، چنانچہ میں نے یہ ڈرامے لکھے۔ داد اس بات کی چاہتا ہوں کہ میرے دماغ نے میرے پیٹ میں گھس کر یہ چند مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں، جو دوسروں کو ہنساتے رہے ہیں۔ مگر

میرے ہونٹوں پر پتلی سی مسکراہٹ بھی پیدا نہیں کرسکے

ظاہر ہے کہ جو چیز TO ORDER تیار ہوگی اُس میں وہ بات نہیں ہوگی جو دل سے نکلنے والی بات میں ہوگی۔ لیکن ادیب کو بھی اپنا پیٹ تو بہرحال بھرنا ہے تاکہ اُس میں "دل کی بات" کہنے کی سکت باقی رہے۔ اور جب تک عوام سے وہ سرپرستی نصیب نہ ہوسکے جو آرٹسٹ کو ترقی یافتہ ملکوں میں نصیب ہے اُسے یہ 'مزدوری' کرنی ہی پڑے گی۔

منٹو اقبال کا یہ مصرع اکثر پڑھا کرتا تھا ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

یہ بچپن کی اُس فضا کا ردِّ عمل تھا جس میں اُس نے خود کو کبھی محفوظ و مامون محسوس نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑھ بڑھ کے خطرے مول لئے۔ اُس نے سوچا کہ زندگی میں اگر خطرہ ہی خطرہ ہے تو اُس کی آمد کا انتظار کیوں کیا جائے۔ کیوں نہ اُس کی پیش قدمی کی جائے۔ مگر اس استدلال کے باوجود اُسے سکون و اطمینان اور کسی گوشۂ عافیت کی ضرورت تھی جو اُسے صبح و شام کی روٹی کے دھندے سے آزاد کر دے۔ چنانچہ جب آل انڈیا ریڈیو دلّی میں اس کی سبیل بنی تو وہ اُس پر روزہ دار کی طرح لپکا —— "تین عورتیں" اور "آؤ" کے سلسلوں کے ڈراموں کو چھوڑ کر اُس کے بیشتر ڈرامے آل انڈیا ریڈیو دلّی کی "ملازمت" کے دوران میں لکھے گئے

جن حالات میں یہ ڈرامے لکھے گئے اُن کا ذکر میں پہلے بھی کرچکا ہوں۔ اُسے

ہر ہفتے دو تین کھیل یا فیچر لکھنے پڑتے تھے۔ اور اُس کا ٹائپ رائٹر کبھی خاموش نہیں رہتا تھا۔ اِس کے باوجود وہ "منٹوویت" سے خالی نہیں۔ اُس کے ڈرامے 'جرنلسٹ' پر اردو اخباروں میں جو ہنگامہ ہوا تھا اُس کا موازنہ صرف GEORGE ORWELL کے ناول کی ڈرامائی پیش کش سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بی۔ بی۔ سی سے براڈکاسٹ ہوا تھا اور جس میں مستقبل کے آمرانہ نظام اور اشتراکی سامراج کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ منٹو کے ڈرامہ کا موضوع اتنا عالمگیر نہیں تھا لیکن اُس میں رائے عامہ کے ترجمانوں — صحافیوں کی کس مپرسی دکھا کر "صحافتی سامراج" پر طنز کی گئی تھی۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی صحافی جن کی وکالت منٹو نے کی تھی، اُس کے خلاف ہو گئے اور اخباروں میں طوفان برپا ہو گیا کہ منٹو نے اخبار نویسی کے پیشے کی توہین کی ہے۔ اس میں شاید اخبار نویسوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بے چارے تنخواہ دار ملازم شاید اُس آواز کے خلاف شور مچانے پر مجبور رکھتے جو اُن کے اخباروں کے مالکوں کے خلاف بلند ہوئی تھی۔

"جرنلسٹ" کا ہیرو باری ہے — ہمارے پیر و مرشد باری علیگ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور شاید اُن کے اُن رفقائے کار کو بھی معلوم ہے کہ باری صاحب کو بعض اوقات مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہوٹلوں والے مہربان نہ ہوتے تو وہ سچ مچ فاقوں مر جاتے۔ دوسرے صحافیوں کی حالت بھی کچھ کم ابتر نہیں تھی ان حالات سے اُکتا کر باری صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم سے تو وہ شخص بہتر ہے جو دن بھر مشین پر چارا کاٹتا ہے اور شام کو دو تین روپے 'ڈب' میں ڈال لیتا ہے۔

تو سے ۴ آنے کی روٹی کھاتا ہے، دو پیسے کی بیڑی پھونکتا ہے، بارہ آنے کی شراب حلق میں انڈیلتا ہے کہ تھکان دور ہو جائے اور باقی پیسے سینما یا ہیرا منڈی کی تفریح کے لئے بچا لیتا ہے۔ باری صاحب تو خیر چارا کاٹنے کی مشین کے خواب ہی دیکھتے رہے۔ سرخ انقلاب برپا کرنے کی طرح یہ بھی اُن کا ایک رومان تھا۔ لیکن منٹو کو ڈرامے کا موضوع ہاتھ آ گیا۔

باری :- (کاتب سے) ہاں بھئی۔ تو مجھے اب کیا
کرنا ہے ــــ تمھیں لیڈر کی آخری سلپ دینا
ہے اور تمھیں پہلے صفحے کی سرخیاں لکھ کر دینا ہے

کاتب : اور مجھے خبروں کا ترجمہ

باری : اور پروپرائٹر صاحب کو اپنی مومیائی۔

....

پروپرائٹر: باری صاحب آپ کی شکایات بجا ہیں
مگر کیا آپ نے میری مشکلات پر بھی غور کیا۔
اس اخبار سے مجھے کیا فائدہ ہے ــــ میں
تو صرف قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔

باری : میں قوم کی اخبار کی اور آپ کی خدمت
کرتا ہوں۔ لیکن اس خدمت کا معاوضہ

مجھے وقت پر نہیں ملتا...... چار مہینے
سے آپ نے مجھے صرف سولہ روپے دیئے
ہیں۔ خدا کا خوف کیجئے۔ میں انسان ہوں
پتھر نہیں ہوں۔ مجھے بھی بھوک لگتی ہے
...... مجھے آپ نے اس اخبار کا ایڈیٹر
بنایا تھا۔ سنیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا۔
جو میں نے دنیا تیاگ دی ہو۔
پروپرائیٹر: روپے کی مشکلات مجھے بھی ہیں۔
باری: یہ بالکل غلط ہے۔ ابھی کل آپ نے اپنے
بچوں کے لیے ریڈیو خرید لیا ہے۔ نئی آبادی
میں آپ کی تیسری کوٹھی بن رہی ہے.....
میں چاہتا ہوں میرا حساب چکا دیا جائے۔
پروپرائٹر: آپ کسی اور اخبار میں جانا چاہتے
ہیں ؟
باری: جی نہیں —— میں گھاس چھیلنا شروع
کر دوں گا۔ لیکن کسی اخبار میں کام نہیں
کروں گا۔

لیکن پروپرائٹر پورا حساب نہیں چکاتا۔ باری کو صرف پچھتر روپے ملتے ہیں اور وہ چارا کترنے کی مشین خرید لیتا ہے۔ اب اُس کی مزے میں گذرتی ہے۔

باری: روز ڈیڑھ دو روپے کی آمدن ہو جاتی ہے۔ خبریں ترجمہ کرنا پڑتی ہیں۔ نہ کاپی جوڑنا پڑتی ہے ٹیلیفون کی بک بک ہے، نہ مراسلوں کی بکواس۔ گرمیوں میں دوکان کے باہر چھڑکاؤ کر کے سو جاتا ہوں۔ سردیاں آئیں گی۔ تو اندر گھاس کے پاس چارپائی بچھالوں گا ــــ کتنی اچھی زندگی ہے۔

شراب بھی اِس زندگی کا ایک جزو ہے۔ لال پری کے عاشق مزے میں ہیں۔ لالہ چھجو مل کلال کی دوکان اُن کے قہقہوں سے گونج رہی ہے۔

باری: سارے دکھ اڑنچھو ہو گئے۔۔۔۔ میں خوش ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔

شرابی ۲: تو خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ میں خوش ہوں تو، تُو بھی خوش ہے۔

شرابی ۱: اور کیا ہم خوش نہیں

شرابی ۲:۔ تو بھی خوش ہے۔

ایک آدمی: بھئی کچھ سنا تم نے — جنگ چھڑ گئی۔

دوسرا آدمی: سچ مچ!

اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جنگ چھڑے اور باری چپکا بیٹھا رہے۔

باری: مجھے پہلے ہی اس بات کا کھٹکا تھا۔ میں
نے 'خلق' میں آج سے دو برس پہلے پیش گوئی
کی تھی......

شرابی: باری تجھے آج کیا ہو گیا ہے۔ کیا بہکی بہکی
باتیں کر رہا ہے۔ زیادہ تو نہیں پی گیا۔

یہ باتیں شرابیوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ لیکن باری کے اندر جو صحافی اور مصلح
سو رہا ہے بیدار ہو چکا ہے۔

باری: یہ جنگ یورپ میں ایک نہیں سیکڑوں
زلزلے پیدا کرے گی...... بڑے بڑے
خوبصورت شہر ملبے کا ڈھیر ہو جائیں گے۔
ہزاروں خاندان بے گھر اور بے در ہو جائیں گے

باری کے یہ الفاظ ہمارے گرو کی شخصیت کا ایک اور پہلو روشن کرتے ہیں۔ ایک
طرف تو وہ انقلاب چاہتا تھا اور دوسری طرف جنگ سے لرزہ بر اندام نظر آتا ہے
اور اُسے خوبصورت شہروں کی تباہی کا افسوس ہے۔ وہ اپنے شرابی دوستوں کے

سامنے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے جو باری جیسے جرنلسٹ کا ہی کام ہے۔ اِس تقریر کے بعض جملے باری صاحب کے اپنے الفاظ ہیں۔

باری: میں پوچھتا ہوں آخر یہ ہماری مہذب
دنیا کدھر کو جا رہی ہے؟ کیا ہم پھر
زمانۂ جہالت کی طرف واپس جا رہے ہیں
کیا ایک بار پھر انسان کا خون پانی سے
ارزاں بکے گا..... بے اصولی نے سیکڑوں
اصول اور تفرقہ پردازی نے ہزاروں جماعتیں
پیدا کر دی ہیں ـــ "انسان انسان کے
خلاف نبرد آزما، ملّت ملّت سے ستیزہ کار"
یہ ہے بیسویں صدی کی عبرتناک داستان...
ہر طرف تشدد کا بول بالا ہے.... لاکھوں
نوجوان بے مقصد، اِدھر اُدھر مارے مارے
پھر رہے ہیں۔ اِس زائد توانائی کا نتیجہ
تشدّد اور انقلاب ہے۔ میرا پریس کہاں
ہے؟ میں اپنے خیالات نشر کرنا چاہتا ہوں"

اِن خیالات کو نشر کرنے کے بجائے پریس الٹا بگڑ گیا اور یہ ڈرامہ دوبارہ ریڈیو

سے بھی نشر نہ ہو سکا۔ جرنلسٹ کے باری نے جو الفاظ اُس وقت کہے تھے وہ ہمارے لیے آج بھی قابلِ غور ہیں۔

"جرنلسٹ" کا موضوع منٹو کے افسانوں کے موضوع سے ہٹ کر ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنے خاص کرداروں کو بھول گیا ہے جن کا تعلق سماج کی تلچھٹ سے ہے۔ اِس سلسلے میں "جیب کترا" اُس کا سب سے اہم ڈرامہ ہے۔ کاشی ایک پیشہ ور جیب کترا ہے۔ جیبیں کترنا اُس کی عادتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ اور کچھ نہیں ہوتا تو وہ اپنی جیب سے چیزیں نکال کر اپنے ہاتھوں کی عادت پوری کرتا رہتا ہے لیکن ایک مصیبت زدہ عورت کے بٹوے سے اُسے ایک ایسی دستاویز ملتی ہے جو اُس کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگا دیتی ہے۔

منٹو کی کسبیوں کی طرح بملا بھی ایک دغا باز مرد کی محبّت کا شکار ہو چکی ہے۔ لیکن وہ کسبی نہیں ہے، گرلز سکول کی اُستانی ہے۔ اُس کا راز اب ایک جیب کترے کو بھی معلوم ہو چکا اور وہ ڈرتی ہے کہ جیبیں کترنا چھوڑ کر وہ اُس کا دل کترنا شروع کر دے گا اور اس راز کو چھپائے رکھنے کی قیمت طلب کرے گا جو اُسے بٹوے کی دستاویز —— ایک خط کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔ بملا کہتی ہے:

کسے معلوم ہے کہ ایک کمزور و ناتواں عورت

چار برس سے ایک اکھشس کو اپنا خون پلا رہی

ہے۔ اِس جرم کی پاداش میں کہ اُس نے محبت کی

اور ماں بن گئی۔ محبت مٹ گئی لیکن اُس کی تھکاوٹ
باقی ہے ۔۔۔ بچی مر گئی مگر مامتا ابھی تک زندہ ہے
یہ دو لاشیں ہیں جن کو وہ اپنے سینے سے لگائے
کچھ دن جینا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی قیمت طلب
کی گئی۔ اس لیئے کہ دنیا بیوپار پر چلتی ہے۔ یہاں
یہاں دکھ بھی مفت نہیں ملتے۔ عورت کی ایک
کمزوری چومنزلہ مکان کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش
ہے۔ یہ کسی بیوپاری مرد کے ہاتھ آجائے تو وہ
اس سے کرایہ وصول کرتا رہتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو ایک سرکاری ادارہ تھا لیکن وہاں بھی منٹو اپنے دل کی بات کہنے سے نہیں چوکتا۔ جس بے باکی سے منٹو تلخ سے تلخ حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ شاید اُس کی مثال دنیا کے ادب میں نہیں ملے گی۔ وہ لگی لپٹی نہیں کہتا۔ وہ بے باکانہ بڑھ کر سماج کے جسم سے وہ چادر اُتار پھینکتا ہے۔ جو اُس کے ناسوروں کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ ہمارے شہروں میں "بملا کے مکان" کا کرایہ وصول کرنے والوں کی کمی نہیں۔ طلوعِ آزادی سے پہلے میں ایک ایسے اخبار نویس کو جانتا تھا جس کی گذر بسر ہی اس "کرایہ" پر تھی۔ لیکن کانشی جیب کترا یہ نہیں کر سکتا۔ وہ کہتا ہے۔

"میں سارے کا سارا اچھا ہوں۔ ایک میری یہ

انگلیاں بُری ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی اچھی

بن جائیں۔"

بملا بھی یہی چاہتی ہے لیکن اُس کی انگلیاں اپنی عادت سے باز نہیں آتیں۔ بملا اُس سے مایوس ہو جاتی ہے اور رو دیتی ہے۔ اُس کے آنسوؤں کو دیکھ کر کانشی پھر وعدہ کرتا ہے کہ "میں اچھا بننے کی پوری کوشش کروں گا ـــــ میں جاتا ہوں۔ اپنے کو درست کر لوں پھر تمہیں منہ دکھاؤں گا۔" وہ چلا جاتا ہے۔ نہ جانے اُس نے اپنے جی میں کیا سوچ رکھی ہے۔ کانشی کی روانگی کے بعد منٹو اپنا خاص پینترا بدلتا ہے اور ہم پہلی بار اُس دغاباز مرد کی آواز سنتے ہیں جو "بملا کے مکان" کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ اس بار وہ اُن خطوں کے عوض جن میں بملا کا راز دفن ہے یکمشت سودا کرنا چاہتا ہے۔ اُس وقت بملا کو ایک ترکیب سوجھتی ہے کیا کانشی کی انگلیاں جو کبھی بے کار نہیں رہ سکتیں اور اپنی عادت سے مجبور ہیں، اتنا کام بھی نہیں کر سکتیں ـــــ لیکن کانشی اچھا بن چکا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹوا چکا ہے اور یوں "جیب کترا" ایک دوہری ٹریجیڈی بن جاتی ہے۔ اور بملا منٹو کے ڈرامے "اکیلی" کی ہیروئن سوشیلا کی طرح پھر بے یار و مددگار نظر آتی ہے ـــــ اکیلی!

جس طرح بملا اپنی پہلی محبت کو ڈھونڈ رہی ہے اور اس کی لاش اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اسی طرح سوشیلا بھی اپنے پہلے محبوب، اپنی پہلی محبت

کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ موہن جس کے ساتھ وہ سراج کی طرح اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر گہنا پاتا لے کر بھاگی ہے لیکن وہ ریلوے سٹیشن پر اس کی ساری پونجی لے کر چمپت ہو جاتا ہے اور سوشیلا جس کے لئے اب ماں باپ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ ایک تماش بین کشور کے ہتھے چڑھ جاتی ہے جو اُسے دنیا کی ہر چیز دیتا ہے لیکن محبت نہیں دے سکتا۔ سوشیلا بازاری کسبی نہیں بنتی، وہ ایک سیٹھ کی داشتہ ایک سوسائٹی گرل بن جاتی ہے۔ کشور کا کردار دیکھئے:

"بھئی سوشیلا خوب ناچتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے ہوا میں سگرٹ کا دھواں پریشان ہو رہا ہے
آنکھوں کے سامنے خوبصورت اداؤں اور لچکیلے
خیالات کا ایک بھنور سا بن جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں
آتا تم کہاں سے شروع ہوتی ہو اور کہاں ختم
ہو جاتی ہو۔"

منٹو کے یہاں خوبصورت الفاظ اور انوکھی تشبیہوں کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن وہ ان کا استعمال بے محل اور بے مقصد نہیں کرتا۔ کشور کے خوبصورت الفاظ اُس کے جذبات کے کھوکھلے پن کا اعلان کرتے ہیں اور سوشیلا چپکی نہیں رہ سکتی۔

"آپ نے داد دی تو کیا ہوا —— میں کچھ اور
بھی چاہتی ہوں —— یہ مکان، اس کے آٹھ بڑے

بڑے سنسان کمروں۔ تین چار نوکروں کی جھکی ہوئی

کمر کے آگے کیا اور کچھ بھی نہیں..... میں سوچتی ہوں

اِس گھر میں، میں ایک تپائی ہوں جس کو آپ

مرضی کے مطابق سجاتے رہتے ہیں.....

کشور صاحب آپ عورت کو بالکل نہیں جانتے

وہ مرد عورت کو کیا جانے جسے وہ کھوئے ہوئے

ٹکٹ کی طرح پلیٹ فارم پر مل گئی ہو.....

آج سے دو برس پہلے جب گھر سے بھاگ کر

سونے اور چاندی کے چور موہن کے ساتھ ریل گاڑی

میں سوار ہوئی تھی، اُس وقت میرے دل میں

جو چاہ تھی مجھے اب بھی یاد ہے۔ وہی نامکمل چاہ

وہی پیاسی خواہش میرے اندر تڑپ رہی ہے

——میں اکیلی ہوں کشور صاحب، میں اکیلی ہوں!

اُس کی تنہائی اور اکیلے پن کے احساس کو دور کرنے کے لئے رائے بہادر لالہ کشور چند اُسے ہجوم میں لا کھڑا کرتا ہے۔ سوشیلا دیوی وار فنڈ کے مِنے سٹیج پر رقص کرتی ہے۔ ہجوم جی کھول کر داد دیتا ہے۔ ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھتا ہے۔ لیکن خود غرض مرد یہاں بھی کچھ اور ہی سوچ رہا ہے۔ رائے بہادر کو اس وقت بھی

اپنی ہی سوچ ہے۔ وہ پوچھتا ہے: "تم نے میری تالی کی آواز سنی تھی سوشیلا؟"
کس قدر ستم ظریفی ہے۔ سوشیلا کچھ اور ہی سوچ رہی ہے۔" میں نے کسی تالی کی آواز
نہیں سنی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ تقدیر کے دو بڑے بڑے ہاتھ میرے کانوں
کے پاس نہ ختم ہونے والی تالی پیٹ رہے ہیں ــــ اُف یہ آواز کس قدر بھیانک
آواز تھی!"

اِسی نامکمل چاہ کا احساس "نقشِ فریادی" میں ایک بار پھر ہمارے پردہ سماعت
پر نمودار ہوتا ہے۔ "اکیلی" میں گھنگروؤں کی جھنکار اور تالیوں کی آواز اسے دور نہیں
کر سکتی اور "نقشِ فریادی" میں نغموں کا زیر و بم۔ سہیل موسیقار ڈرامے کے آغاز میں
نجمہ کو آگ کے شعلوں سے بچاتا ہے اور چند روز اُس کے ساتھ گذار کر دوسری عورتوں
کے ہاں اپنی نامکمل چاہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اُس کا نغمہ جو در اصل اُس کی رُوح
کی طربوں میں مچل رہا ہے، وہ سُر نہیں ڈھونڈ سکتا جس سے اُس کی تکمیل ہو سکے۔ وہ
سُر اس آگ بجھانے والے انجن کی آواز میں پوشیدہ ہے جس سے اُس کی رُوح اس
وقت آشنا ہوئی تھی جب نجمہ کے گھر کو آگ لگی تھی اور اُسے بچانے کے لئے وہ شعلوں
میں کود پڑا تھا۔ اسے ایک ہرجائی مرد کے ضمیر کی آواز بھی کہا جا سکتا ہے اور فن کار
کی وہ تشنگی بھی جو کبھی نہیں مٹتی۔ آرٹسٹ کو اپنا آئیڈیل شاید کبھی نہیں ملتا۔ مل جائے
تو غالباً اس کی جستجو اُس کا آرٹ ختم ہو جائے۔ فائر انجن کے بلاوے پر ایک بار پھر
آگ میں کودنے سے پہلے سہیل اُن تمام عورتوں کے ساتھ، جن کی صحبت میں وہ اپنے

نامکمّل نغمے کی تکمیل کرنا چاہتا ہے، وہ تاروں کی چھاؤں میں ایک محفل گرم کرنا چاہتا ہے،

"آج میں سازوں کے تمام سُر بے چین کردوں گا
——آج رات ایک نئی زندگی شروع ہو۔ پرانے
نقش آج پیروں سے مٹادئے جائیں گے۔ ان کے
بدلے نئے بیل بوٹے بنیں گے۔"

لیکن عین اُس وقت فائر انجن کی آواز آتی ہے۔ اس آواز میں اُسے نجمہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس خوفناک آواز میں اُسے وہ سُر سنائی دیتا ہے جس کے بغیر اُس کا نغمہ مکمّل نہیں ہوسکتا۔ اور اس سُر کی تلاش میں، اس سُر کو اپنی زندگی کی تکمیل کی خاطر بچانے کے لیے وہ ایک بار پھر آگ میں کود پڑتا ہے اور لوگ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ "روئی کے گودام میں آگ لگی تھی۔ سہیل اس میں کیوں کود گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"
—— یہ باتیں ہر کس وناکس کے سمجھنے کی نہیں ہوتیں۔

"نقشِ فریادی" کی بازگشت کوئی بارہ برس بعد "اس منجدھار میں سنائی دیتی ہے امجد اپنی حسین وجمیل بیوی سعیدہ کو بیاہ کر لارہا ہے کہ گاڑی پٹڑی سے اُتر جاتی ہے اور امجد اپاہج ہوجاتا ہے۔ دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ اور وہ رات کبھی نہیں آتی جس کے تصوّر سے ہمارے دیوان پُر ہیں۔ امجد صرف اُس رات کا فریب دے سکتا ہے اور بس!

امجد: سعیدہ!

سعیدہ : جی

امجد : کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے...

وہ رات جو ابھی تک نہیں آئی۔

سعیدہ : کیسے امجد صاحب

امجد : جھوٹ موٹ ..... محض میرے بہلاوے

کے لئے ..... تم یہ فرض کر لو کہ تم میرے

پہلو میں لیٹی ہو۔ میں تم سے وہی باتیں شروع

کروں گا جو پہلی رات مجھے تم سے کہنا تھیں

..... تم اسی طرح جواب دینا جس طرح کہ

تمھیں دینا تھا..... میرے لئے تم یہ جھوٹ موٹ

کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ

سعیدہ : میں حاضر ہوں امجد صاحب ۔

(طویل وقفہ)

امجد : آج ہماری پہلی رات ہے سعیدہ ۔ وہ رات

جس کی پہنائیوں میں دو جی غوطہ لگاتے ہیں۔

اور ایک ہو جاتے ہیں ۔ شرماؤ نہیں....

یہ وہ رات ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں

کے گھونگٹ اُٹھنے کے لیے بیتاب ہوتے
ہیں...... یہ وہ رات ہے جس کی درازیٔ عمر
کے لیے شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ابھی
تک نہیں تھکا۔ یہ وہ رات ہے جس کے
حصول کے لیے جوانی کی رِجائے نماز بچھا کر
زندگی اکثر سجدہ ریز رہتی ہے۔ یہ وہ رات
ہے جس میں حجاب کی گرہیں فطرت کے ناخن
خود کھولتے ہیں...... یہ وہ رات ہے،
ہر آنے والی رات جس کے حضور جھولی پھیلائے
بھیک کی منتظر رہتی ہے۔

لیکن یہ فریب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ امجد کا احساس کہ وہ اپاہج ہے
اِس حسین رات کے تصور کو کانچ کے کھلونے کی طرح چکنا چور کر دیتا ہے اور وہ چیخ
اٹھتا ہے:

ڈھانپ لو ــــ ڈھانپ لو ــــ سعیدہ
اپنا بدن ڈھانپ لو۔ اس کا ایک ایک
خط تلوار کی طرح میری ٹوٹی خواہشوں پر پھر
رہا ہے ــــ ڈھانپ لو، خدا کے لئے

اپنا جسم ڈھانپ لو۔

لیکن سعیدہ لولی نہیں۔ اُس کے انگ، انگ میں جوانی کی خواہشیں بیدار ہیں۔

اُس کے اچھوتے بدن کا روُاں روُاں اُس رات کا منتظر ہے جس کی خاطر لڑکیاں "ادھیاں ڈالتی" ہیں، جس کی داستانیں نوبیاہتا سہیلیوں کی سرگوشیوں میں نغموں کا زیر وبم بن جاتی ہیں اور روح ان دیکھے گھنگھروؤں کی آواز پر رقص کرنے لگتی ہے یہ وہ رات ہے جس کی خاطر ہاتھوں میں مہندی رچتی ہے اور جسم کے روئیں روئیں کو خوشبوؤں میں بسایا جاتا ہے۔ یہ وہ رات ہے جس کی خاطر رتجگے ہوتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ لیکن ـــ لیکن سعیدہ کی زندگی میں یہ رات، قریب آکر بھی دور رہ جاتی ہے امجد، اُس کا شوہر، اس رات کے بھید کھولنے سے پہلے ہی اپاہج ہو چکا۔"

مگر سعیدہ اپنی آرزوؤں کا گلا کب تک گھونٹ سکتی ہے۔ وہ جوان ہے، حسین ہے اور ـــ اور امجد کا بھائی مجید بھی جوان ہے، حسین ہے۔ امجد کی خادمہ اصغری اس راز سے واقف ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ بات ابھی وہاں تک نہیں پہنچی کہ تلافی نہ ہو سکے۔ اُسے امجد سے ہمدردی ہے۔ اور یہ ہمدردی آہستہ آہستہ محبت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ وہ دلہن بیگم کے مہین مہین چٹکیاں بھرتی رہتی ہے۔ لیکن سعیدہ بھی جان چکی ہے کہ اصغری اُس کے راز سے آشنا ہے۔

اصغری: آپ بڑی ہمّت والی ہیں دولہن بیگم

سعیدہ: میں ہمت والی ہوں، یا بزدل تم اسے

چھوڑو ــــ جو کہنا چاہتی ہو۔ آج اُگل ڈالو۔

اصغری: یہ قصے آپ کو اور مجھے دونوں کو

تکلیف دے گی۔

سعیدہ: میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو۔

میں برداشت کر لوں گی..... تم مجھے یہ

بتاؤ کہ اگر امجد میاں گاڑی کے حادثے میں

مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری: آپ؟ ــــ مجھے نہیں معلوم آپ

کیا کرتیں۔

سعیدہ: میں جوان ہوں، حسین ہوں۔ میرے

سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں۔ جو

میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد

پلا کر پالتی پوستی رہی ہوں ــــ میں ان کا

گلا نہیں گھونٹ سکتی..... میں اپنی جوانی کا

باغ، جس کے پتے پتے، بوٹے بوٹے میں

میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ
رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑ سکتی۔
......میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی
ہوں اصغری، جہاں زمین میرے قدموں
کے نیچے گھوم رہی ہے۔ میں جس راستے کی
طرف منہ کرتی ہوں، وہی مجھ سے منہ موڑ
لیتا ہے —— کیا ہی اچھا ہوتا اگر امجد صاحب
کے بجائے میں اپاہج ہو جاتی —— بتاؤ
مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اصغری: کیا کرنا چاہیئے؟ —— آپ کو،
آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا
چاہیئے۔

سعیدہ: لیکن میں پوچھتی ہوں —— انھیں موت
کب آئے گی؟

اصغری: جب اللہ میاں کو منظور ہوگا.....

ایک امجد کے سوا ہر کوئی اس راز سے آگاہ ہے کہ "دلھن اپنے میاں کے چھوٹے
بھائی کو چاہنے لگی ہے۔ امجد کی ماں چاہتی ہے کہ مجید کراچی چلا جائے۔ تاکہ اُس

کی کشتی "اِس منجدھار میں سے جسے زندگی کہتے ہیں۔ صحیح و سالم کنارے تک" پہنچ سکے۔
لیکن امجد جو اس طوفان سے ناآشنا ہے۔ جس میں اُس کی بیوی اور بھائی گھرے ہوئے
ہیں نہایت ہی معصومیت سے اُسے کراچی جانے سے روک دیتا ہے۔ اور یوں
اپنی ٹریجیڈی کا آپ ہی سبب بن جاتا ہے ــــ منٹو کے یہاں ایسے کئی ڈرامائی ذرائع
نہایت بے تکلفی سے آتے ہیں۔ اور نقاد سوچتا رہ جاتا ہے کہ یہ شخص جو ایف۔ اے
بھی پاس نہیں کر سکا تھا، یہ باتیں کہاں سے سیکھ گیا ــــ میں اسے اللہ کی دین کہوں گا۔
خیر وہ مجید کو روک دیتا ہے۔ وہ اگر چلا جاتا تو ڈرامہ اپنے عروج کو نہ پہنچتا۔ اور
اغلب یہی تھا کہ سعیدہ کی جوان امنگیں خود بخود دم گھٹ کر رہ جاتیں اور ہمارے معاشرے
میں ایک اور "بوڑھی کنواری" کا اضافہ ہو جاتا۔ جس کی قربانی تو ضرور ضرب المثل قسم کی
روایت بن جاتی لیکن ڈرامہ ختم ہو جاتا۔ امجد کا مجید کو روک لینا ڈرامے کا ایک موڑ
ہے جس پر اُسے اپنی حسین بیوی اور اپنے بھائی کے راز سے آگاہ ہونا ہے ــــ
یہ راز کہ وہ اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی اُسے ایک اور
حقیقت سے بھی آشنا ہونا ہے کہ اُس کی بدصورت خادمہ ہی اُس کی واحد ہمدرد
ہے ــــ وہ ہمدردی جو اُسے اپنی بیوی سے ملنی چاہیے تھی۔ جسے وہ ہزاروں
میں سے انتخاب کر کے لایا تھا، ایک نوکرانی کے پیکر میں نظر آتی ہے۔ پھر وہی ظاہر
و باطن کا مسئلہ ہے۔ اِنسانیت کا جوہر کہیں بھی مل سکتا ہے۔ اگر وہ کسبی کے ہاں،
بھڑوئں اور تماشبینوں کے ہاں مل سکتا ہے تو ایک بدصورت نوکرانی کے ہاں کیوں

نہیں مل سکتا۔ اصغری کے ہاں جو اس کی پہیئوں والی کرسی کو لئے پھرتی ہے، اصغری جو اس کی ٹانگیں بن گئی ہے۔

امجد: میری حالت میں جو آدمی ہو اُس کے بدھو پنے کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کر دیکھتا، زخموں کی زبانی ٹیسوں کی کہانی سنتا ہے۔ اور خود کو شہید سمجھتا ہے ..... اصغری تمہاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں۔ اس لئے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست و ریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری: میں ان حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں — بڑی اونچی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں۔ ایسا کرتے کرتے میرے دل میں بھی گڑھے پڑ چکے ہیں۔

امجد: (کانپ جاتا ہے) اصغری — تم بڑی

خوفناک ہو۔

اصغری: ہر اُجاڑ خوفناک ہوتی ہے......

امجد: تمہاری زندگی بھی کسی حادثہ سے دوچار

ہوئی؟

اصغری: جی نہیں۔ اُس شخص کی زندگی کسی حادثے

سے کیا دوچار ہوگی۔ جو خود ایک حادثہ

ہو۔

امجد: تمہاری باتوں سے جلے ہوئے گوشت کی

بُو آتی ہے۔

اصغری: آپ کے سونگھنے کی حس جاگی ہوئی ہے

امجد: اسے کس نے جگایا؟

اصغری: اُس گاڑی نے جو پٹڑی سے اتر گئی۔

امجد کی حس کو ابھی اور جاگنا ہے۔ ابھی اسے اپنے کانوں سے سننا ہے کہ اُس کی بیوی اور بھائی اُس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

مجید: ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے

زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے....

غریب سے زندگی کا اتنا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے

یہ منجدھار

مجید کس قدر "رحمدل" ہے۔ اور سعیدہ بھی۔

"کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک وہ

زندہ ہیں، خوش رہیں۔ اُن کے احساسات

کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے"

لیکن مجید کو ڈر ہے کہ "اگر ہمارا کوئی چھالا رگڑ کھا کے پھوٹ پڑا تو......"

مجید کی طرح اصغری کے دل میں بھی ایک چھالا ہے جس کی ٹیسیں بار بار اُس کی باتوں کا روپ دھار رہی ہیں لیکن وہ امجد کو اس سوچ سے باز رکھنا چاہتی ہے کہ دوسرے اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔

امجد: تم مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو۔

تم بڑی ظالم ہو اصغری!

اصغری: محبت بڑی ظالم ہوتی ہے امجد میاں

۔۔۔ کم بخت اپنی موت پر بھی ناچنے سے

باز نہیں آتی۔

اصغری کا چھالا پھوٹ پڑا۔ امجد کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ وہ ایثار جس کی توقع اُسے سعیدہ سے تھی، اصغری کے قالب میں اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اصغری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتا ہے:

"یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی؟"

اصغری جواب دیتی ہے:

"ردی کی ٹوکری میں ——— اپنی صحیح جگہ پر"

اب امجد کے فیصلے کا وقت آگیا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ انسان کی نجات چاہے جانے میں نہیں، چاہنے میں ہے۔ محبت اپنا صلہ آپ ہے۔ اُس کا درد انسان کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ گرے پڑے انسانوں کو اُٹھا کر عرش کی بلندیوں پہ پہنچا دیتی ہے ——— اب امجد کو بھی اپنا فیصلہ کرنا ہے۔

منظر وہی کمرہ ہے۔ "پہلی رات" کا کمرہ۔ اور وہی مسہری، جس میں سعیدہ کی "جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر رہی تھی۔

امجد: میرے سامنے آؤ ——— جاؤ مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری: امجد میاں ..... میری جوانی تو کسی کھردرے ٹاٹ کی شرمندۂ احسان ہونا چاہتی ہے (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) ——— نہیں امجد میاں مسہری کو تکلیف ہوگی۔ یہ دولہن بیگم کے نرم و نازک جسم کی عادی ہے،

امجد: میں تمھیں حکم دیتا ہوں۔

اصغری: (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری

میں لیٹ جاتی ہے۔ آنکھیں چھت میں گڑ

جاتی ہیں)

امجد: جانتی ہو آج کون سی رات ہے؟.....

یہ وہ رات ہے جب ایک تڑی مڑی جوانی

اور تُڑم تُڑ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے

—— یہ قیامت کی رات ہے! فنا کی رات!

اس کے اندھیاروں میں وجود، عدم کی بھٹیوں

میں گھل کر سالمیت اختیار کرے گا۔ یہ وہ

رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند

ایوانوں کو جنم دے گی...... یہ وہ رات

ہے جب کاتبِ تقدیر اپنا قلمدان اوندھا

کرکے، عرش کے کسی کونے میں منہ دے کر

روئے گا۔ یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس

دنیا کی تمام خوبصورتیوں کو تین دفعہ طلاق

دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتۂ مناکحت

میں لاتا ہے۔

اِس دوران میں اصغری مسہری سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آجاتی ہے اور نیچے کھڈ میں دیکھ رہی ہے۔ مسہری سے اُٹھ کر اس کا وہاں جانا ڈرامائی پیش گوئی ہے لیکن یہ ایسی پیشگوئی نہیں جس کے نتیجے کے لئے دیر تک انتظار کرنا پڑے۔ منٹو کے ڈراموں میں ہر بات بڑی سرعت سے ہوتی ہے۔ وہ سامعین یا تماشائیوں کو زیادہ سوچنے کا موقعہ نہیں دیتا ——— یہاں بھی وہ امجد سے صرف اتنا کہلواتا ہے

یہ کیا کر رہی ہو اصغری؟

" اصغری کھڑکی کی سِل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے " اور اتنا کہہ کر کھڈ میں کود جاتی ہے کہ " ایجاب وقبول ضروری ہے میرے مالک "۔ اِس کے ساتھ ہی امجد بھی اپنی پہیّوں والی کرسی کو کھیتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچتا ہے اور اصغری! اصغری پکارتا ہوُا، ہاتھوں کی مدد سے سِل کا سہارا لے کر اپنا جسم بلند کرتا ہے اور اصغری کے پیچھے کھڈ میں کود جاتا ہے۔

امجد کے انجام اور منٹو کی موت میں کچھ عجیب مماثلت نظر آتی ہے ——— وہی چاہنے اور چاہے جانے کا مسئلہ ہے جو منٹو کے افسانوں میں بار بار ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُسے باپ کی محبت نصیب نہ ہوئی، عزیزوں نے اُسے آوارہ کا لقب دیا، وہ پہلے امرتسر سے اور پھر بمبئی سے " شہربدر " ہوُا، فحاشی کے الزام پر وہ پانچ مرتبہ کچہریوں میں گیا، سیکڑوں افسانے لکھنے کے باوجود بھی مالی اطمینان

اُسے کبھی نصیب نہ ہو سکا ـــــ ان تمام احساسات کی اذیّت کے احساس کو شل کرنے کے لئے اُس نے بے تحاشا پینا شروع کر دی۔ جس سے اُس کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ وہ ہر جانب سے لعن طعن کا مرکز بن گیا ـــــ کوئی دو تین سال سے وہ سسرال سہارے پڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے داماد کو ایسی حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اُسے جھنجھوڑنے کے لئے انھوں نے تلخ الفاظ بھی استعمال کئے۔ لیکن اُس کی بیوی نے بھی اُسے جگانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اس سے اُس کا احساسِ گناہ اور شدید ہو گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بیہوش رہنے لگا۔ لیکن اُسے آخری وقت تک اِس بات کا ہوش تھا کہ میں ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ شاید اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُردو کے ان ادیبوں کی طرح جنھیں اپنے قلم سے روزی کمانا پڑتی ہے، اب میرے اپاہج ہونے کا وقت قریب آ چکا ہے شاید اُسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ اور شاید اگر وہ زندہ رہتا اور اُسے روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اور لکھنا پڑتا تو اُس کا آرٹ زوال پذیر نظر آتا ـــــ لیکن یہ سب "شاید" کے عنوانات ہیں۔ یقینی بات اُس کی ذلت کا احساس تھا ـــــ

جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا تھا اور خون تھوک رہا تھا تو صفیہ، اُس کی بیوی، ڈاکٹر اور ایمبولنس لانے کے لئے دوڑی۔ تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا ـــــ "مت جاؤ صفیہ مت جاؤ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ اب قصہ تمام ہو چکا۔ ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا کچھ نہیں کر سکے گا...... اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیئے"۔ لیکن صفیہ

ایمبولنس لانے چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد وہ بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا۔
اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیے...... اب یہ ذلت ختم ہو جائے گی.....؟
زندگی کے آخری ایام میں اُس کا چاہنے کا فلسفہ اُس کا ساتھ نہ دے سکا۔
اُس کے دوستوں اور مداحوں کو اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ ہمدردی بانٹتے بانٹتے
شاید اس کا اپنا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ زینو کی شادی پر بابو گوپی ناتھ سے سینڈو،
غلام علی، غفار سائیں، رفیق طوسی اور سردار جیسے لوگوں کے ہاتھ دھلوانے والے
کنوئیں کے سوتے سوکھ چکے تھے اور اسے اپنی سبیل کی سیرابی کے لئے کسی ابرِ رواں
کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اُس بادِ سموم کا ازالہ کر سکے جو اِس نخلستان سے
گذرتی رہی تھی اور جس نے جلتی جھلستی ریت کے تودوں سے اُس ٹھنڈے چشمے کا
سارا پانی جذب کر لیا تھا جس سے تشنہ لب، گم کردہ راہ مسافر اپنی پیاس بجھاتے
تھے۔ اِس "منجدھار میں" کی آخری تقریر میں امجد اصغری سے کہتا ہے:

یہ وہ رات ہے جب زم زم کا سارا پانی
رینگ رینگ کر زمین کی تہوں میں چھپ جائے گا۔
اِس کے بدلے خاک اُڑے گی، جس سے پاکیزہ
روحیں تیمم کریں گی۔

ہمدردی اور محبت کے اُس چشمے کی خاک جانے کس روح کی تلاش میں بگولا
بن کر اُڑ گئی ہے۔ وہ کس اصغری کے پیچھے کود گیا ہے؟ کون سی شاردا اُس کی

تپائی پر اُس کے پسندیدہ سگرٹوں کا بھرا ہوا ڈبہ چھوڑ گئی ہے، کس بگولہ کا بلاوا اُسے موت کی وادی میں لے گیا۔ یاروں دوستوں، مدّاحوں، بیوی بچوں کی آغوش میں آتے آتے جانے وہ کس کوہِ قاف کے پڑاؤ پر ٹھہر گیا۔ کس البیلی چرواہی نے اُس کا راستہ روک لیا ہے ــــ "آب و دانہ" کی ذلتوں بھری دنیا سے دور وہ کس جزیرے میں جا بسا ہے؟

پس ازاں—

اب کہ منٹو دنیا میں نہیں ہے ہم اُسے ہیرو اور شہید اور جانے کیا کچھ بنا رہے ہیں۔ لیکن اُس کے جیتے جی ہم نے اُسے ذہنی اور جسمانی اپاہج بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اب اُس کے بارے میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اس سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات کے قصے لکھے جا رہے ہیں۔ اُس کی فن کارانہ عظمت اُس کی کہانیوں کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جا رہا ہے، اُس کے کرداروں کے نفسیاتی تجزیے ہو رہے ہیں اور اُس کی اتھاہ ہمدردی کی تہہ کی خبر لائی جا رہی ہے — لیکن قدر شناسی کی ان تمام کوششوں کے باوجود (جن میں میری کوشش بھی شامل ہے) مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم کسی کو مار کر اُس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں۔ یہ پوسٹ مارٹم (اس طرح کے ہر پوسٹ مارٹم کی طرح) ہمارے فنِ جراحت کی حدود سے باہر

نہیں جا سکتا ہے۔ نشتر کُند ہیں، ہاتھوں میں رعشہ ہے، بینائی کمزور، ذہن نارسا۔
الہام و القا کی ساعتوں کے اسرار اور تخلیقی کاوشوں کے بارے میں صرف
قیافہ آرائی کی جا سکتی ہے اور بس۔ علم نفسیات ابھی گھٹنوں چلنا سیکھ رہا ہے —
ہمارے ہم عصر فرائڈ کی دو درجن کتابیں ذہن انسانی کے دس بیس یا پچاس ہزار سالہ
ارتقا کی بھول بھلیاں کی صرف ایک آدھ سُرنگ سے آگے نہیں جا سکیں —
(اڈیپس کی دیومالا، ابھی کل کی بات ہے) اور تنقید، تعصبات کا دوسرا نام ہے۔
— میں منٹو کے دوست کی حیثیت سے، اُس کے خیالات کی پاکیزگی، اُس کی
تصانیف کے اصلاحی پہلو، اُس کے ناقابلِ فنا انسانیت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔
لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں (اور اُن کی کمی نہیں) جو اُسے فحش نگار، عریاں نویس،
سنکی سڑی اور بدتمیز گردانتے ہیں۔ یہ سب تعصبات نہیں تو اور کیا ہیں — منٹو
کے مدّاحوں اور مخالفین کے تعصّبات!

میرے تعصّبات آپ جان گئے ہوں گے۔ دوسرے گروہ کے
تعصّبات جاننے کے لئے آپ کو خود منٹو سے رجوع کرنا ہوگا — "لذتِ سنگ"
"زحمتِ مہرِ درخشاں"۔ "مجھے بھی کچھ کہنا ہے" اور "جیبِ کفن" میں اپنے مخالفین
کے "تعصّبات" کے بارے میں اُس نے خاصی سیر حاصل بحث کی ہے۔ میں نے
اُن افسانوں 'بُو'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار'، 'کھول دو' اور 'اوپر نیچے اور درمیان'
کے بارے میں جن کی وجہ سے اُس پر مقدمے چلائے گئے، کچھ نہیں لکھا۔ اِس لئے

کہ منٹو، اپنے خاص انداز میں ان پر بہت کچھ کہہ چکا ہے۔ یوں بھی اُس کے سیکڑوں افسانوں اور ان گنت زنگوں کے بارے میں فرداً فرداً کچھ لکھنا میرے لئے مشکل تھا۔ میں نے 'ممی' جیسے افسانے کے بارے میں بھی (جسے میں اُس کا شاہکار سمجھتا ہوں) کچھ نہیں کہا۔ ممی ایک طویل افسانہ ہے۔ اِس میں اتنے کردار ہیں اور اتنے موڑ کہ وہ کم از ایک طویل باب کا ضرور محتاج ہے۔ مجھے اِس مختصر کتاب میں، بہت کچھ کہنا تھا، اِس کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ اوراق پڑھنے کے بعد آپ "ممی" کی عظمت کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے — "ممی" آپ کے پڑھنے کی کہانی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے منٹو کی ہر تحریر خواہ وہ بقول اس کے "روٹی کے مسئلہ کی پیداوار" ہی کیوں نہ ہو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی کمزور سے کمزور تحریر میں بھی اُس کی انفرادیت چھپی نہیں رہ سکتی — جس طرح لاہور اور دلّی والوں کے لئے خواہ وہ لندن میں ہوں یا پیرس میں، لاہور، لاہور ہی رہے گا اور دلّی، دلّی! اسی طرح منٹو ہر رنگ میں منٹو ہی رہے گا — اور دوستوں کے لئے تو وہ "سعادت" بھی تھا۔ اُس کے خلوص کا حریفوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ اُردو افسانے کے رسیا جہاں اپنے منٹو کو ڈھونڈ رہے ہیں وہاں منٹو کے دوست سعادت کی تلاش کر رہے ہیں — میں اگر جذباتی ہو گیا ہوں تو یہ سعادت کے خلوص کا قصور ہے۔

کرے ہے حرف بہ ایمائے شعلہ قصّہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع